حیاتِ سالک

شیخ التفسیر مفتی احمد یار خان قدس سرہٗ

زندگی ، شخصیت ، خدمات

قاضی عبدالنبی کوکب ایم اے

رضا اکیڈمی ، دائرۃ المصنفین ◎ لاہور
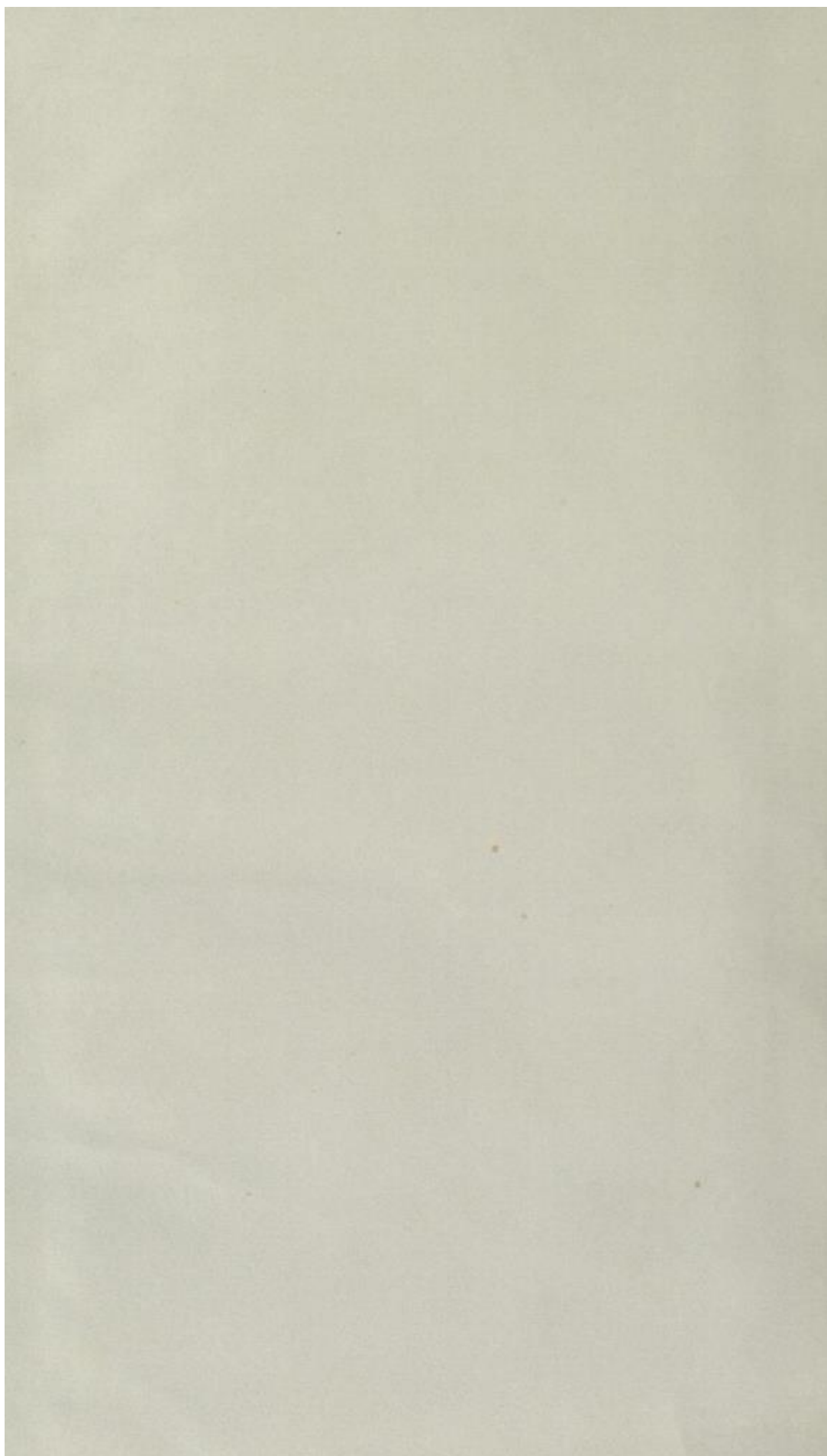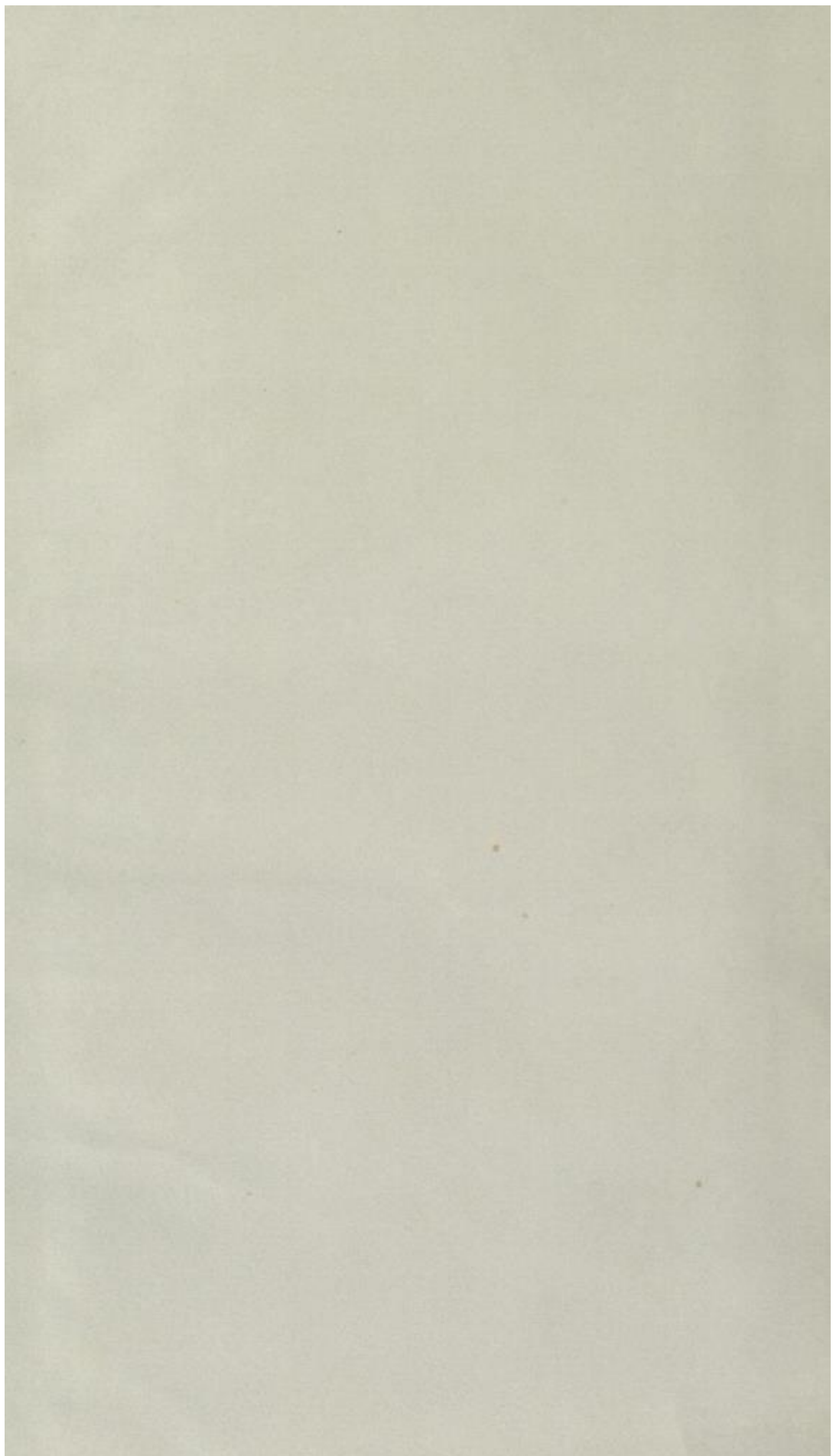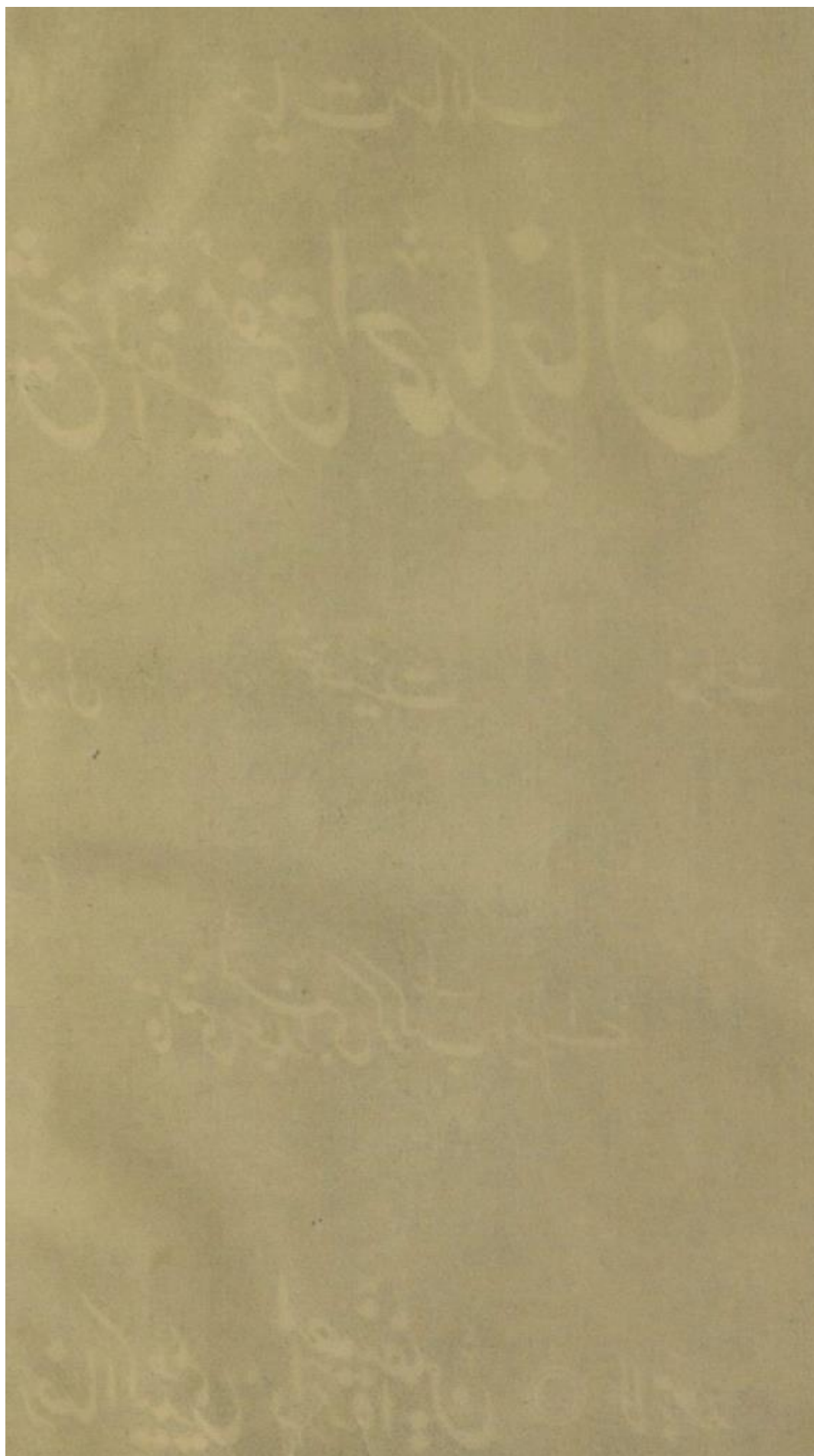
سیرتِ سالک

یعنی

شیخ التفسیر مفتی احمد یار خاں سالکؔ نعیمی بدایونی قدس سرہٗ

کی

سوانح عمری

قاضی عبد النبی کوکبؔ

ناشرین

رضا اکیڈیمی دائرۃ المصنفین (مبارک سنز سٹیشنرز) ۸۔ اردو بازار۔ لاہور

تالیف ــــــــ حیاتِ سالک

مولف ــــــــ قاضی عبدالنبی کوکب

کتابت ــــــــ ادارہ پروینِ کتابت

کتابت سرورق ــــــ حافظ محمد یوسف سدیدی

طباعت ــــــــ کنول آرٹ پریس انارکلی لاہور

ناشر ــــــــ دائرۃ المصنفین (رضا اکیڈمی)

۸۔اردو بازار لاہور

ہدیہ ــــــــ 8/- روپیہ

طبع اوّل ــــ ایک ہزار ــــ ۴۔دسمبر ۱۹۷۱ء

فہرست مشتملات

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ وَنُسَلِّمُ عَلٰی حَبِیْبِہِ الْکَرِیْمِ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ

عرضِ اوّل

اِس کتاب کی تالیف، کتابت اور طباعت کے مراحل انتہائی عجلت میں طے کئے گئے ہیں۔ ۲۷ر اکتوبر کو مفتی صاحب قدس سرہٗ کے سوم کی مجلس میں سوانح جات ترتیب دینے کی تجویز پیش ہوئی اور آج ۲۶ ، ۲۷ر نومبر کی درمیانی شب کو بیٹھا ہوا اس کتاب کے آخری اوراق مرتب کر رہا ہوں۔ خواہش اور مطالبہ یہ ہے کہ کتاب کسی نہ کسی شکل میں چہلم (۴ر دسمبر ۱۹۷۱ء) تک شائع ہو چکی ہو اس عجلت میں راحت کا پہلو یہ ہے کہ یہ نقشِ مجمل جیسا کچھ بھی تیار ہو سکا ہے انشاء اللہ العزیز چہلم کے موقع پر طبع ہو کر احباب کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا مگر افسوس کا پہلو یہ ہے کہ اس کتاب کی ساری فصلیں اپنی اپنی جگہ پر تشنہ رہ گئی ہیں۔ موضوع کے ہر گوشے کو چھیڑا گیا ہے مگر دو چار قدم ہی چل کر اُسے چھوڑ بھی دیا گیا ہے۔ قارئین سے التماس کرتا ہوں کہ وہ کتاب کی اس مخصوص ہیئت ترکیبی کو پہلے ہی ذہن میں رکھ لیں اور مطالعے کے بعد یہ تجویز فرمائیں کہ آئندہ اس کتاب میں کہاں کہاں کیا کیا تفصیلات مندرج ہونی چاہئیں۔ مفتی صاحب قدس سرہٗ کے تلامذہ اور وابستگانِ عقیدت سے میری خصوصی درخواست ہے کہ وہ مفتی صاحب کے احوال و آثار کے بارے میں وہ تمام تفصیلات مجھ تک پہنچانے کی کوشش فرمائیں جو ان کی ذاتی معلومات سے تعلق رکھتی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب قدس سرہٗ کے اثرات و برکات پورے برِعظیم پاک و ہند میں پھیل چکے ہیں اور اس ملک کے ہر حصے میں ان کے عقیدت مند احباب موجود ہیں۔ یہ ساری جماعت تعاون کرنے تو مفتی صاحب

کی عظیم المرتبت شخصیت پر ان کے شایانِ شان ایک عظیم کتاب کا معرضِ تحریر میں آنا کچھ مشکل نہیں رہے گا۔ بہرحال میں نے اللہ کا نام لے کر اس کام کا آغاز کردیا ہے، یہ آغاز اسی موقع پر جلد کردینا ایک اعتبار سے ضروری بھی تھا۔ ایک بنیاد رکھ دی جائے تو آئندہ عمارت کی تعمیر کا سلسلہ بتدریج جاری رہ سکتا ہے، اگر آغاز کرنے میں تاخیر کردی جاتی تو بہت ممکن تھا کہ یہ عزم و ولولہ بھی ہماری روایتی سستی اور بے حسی کے سرد خانوں میں ٹھٹھر کر رہ جاتا۔ بس اسی بات نے میرے لئے اِس عاجلانہ نقشِ مجمل کے پیش کرنے کا جواز مہیا کیا ہے۔

⁂

ایک عاجلانہ کوشش اور انتہائی مختصر تالیف ہونے کے باوجود، یہ کتاب اپنے اصل مقصد کے حصول میں انشاء اللہ ناکام نہیں رہے گی۔ اس کتاب کا مولّف یہ توجہ دلانا چاہتا ہے کہ علومِ دینیہ کی صحیح تعلیم اور دین کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھنے والے لوگوں کے حلقۂ تربیت میں انسانی کردار کو اعلیٰ ترین عظمتیں عطا کرنے والا کیسا زوردار جوہر پایا جاتا ہے، اسی جوہر نے غلامی اور ادبار کے تاریک ادوار میں ہماری تہذیب کی شمعیں روشن رکھی ہیں۔ اگر اہلِ دین کا قائم کردہ یہ تعلیمی و تدریسی ماحول ہمارے ہاں موجود نہ ہوتا تو گذشتہ تین چار صدیوں میں ہماری تہذیب و دیانت کے جملہ آثار کلیتہً محو ہو چکے ہوتے، یہ اہلِ دین کا درسی و تبلیغی نظام تھا جو ایک طرف کروڑوں عامۃ المسلمین میں دینی و ملی حمیت و شعور کے سرمایے کی حفاظت کرتا رہا، اور دوسری طرف صدہا گمنام اور دنیوی اعتبار سے بے سروسامان خاندانوں کے افراد کو تربیت دینی سے علم و فضل اور سیرت و کردار کے آفتاب و ماہتاب بناتا رہا۔

مذکورہ بالا تاریخی حقیقت کی ایک بہترین مثال اس کتاب کی موضوع شخصیت شیخ التفسیر مفتی احمد یار خاں نعیمی بدایونی کی زندگی میں جگمگا رہی ہے، مفتی صاحب جس دَور میں پیدا ہوئے ہیں اس وقت ان کا خاندان ایک قصبے میں دنیا کے ہر معیار کی رُو سے بے سامانی اور بے نشانی و گمنامی کی محدود زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایسے میں اسی خاندان سے گیارہ برس کا ایک بچہ وقت کی

دینی درسگاہوں میں جاکر شوق و محنت سے علومِ دین کی تحصیل میں مصروف ہوجاتا ہے اور چند ہی برس کے بعد وہ فضل و کمال کا نیرّ درخشاں بن کر اپنے خاندان بلکہ پوری ملّت کے لئے فخر کا موقع بہم پہنچاتا ہے۔

❊

کردار سازی کا یہ نظام و ماحول اب ایک عرصے سے بالخصوص آزادی کے بعد سے بڑی تیزی کے ساتھ رُوبہ زوال ہے۔ ہماری تہذیبی تاریخ میں یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ کیا اس کی طرف توجہ کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا؟

❊

دوسری اہم چیز مَیں نے اس تالیف میں یہ مدّ نظر رکھی ہے کہ مبالغہ آرائی اور القاب پرستی کے راستے سے بچ کر چلنے کی کوشش کی ہے۔ مفتی صاحب قدس سرہٗ میرے استاذ، محسن اور مربّی سب کچھ تھے اور مَیں نے ان کی عظمتوں کو بہت قریب سے دیکھا بھی اور شدید متاثر بھی تھا۔ اس لئے مفتی صاحب کی زندگی تحریر کرتے ہوئے مَیں روایتی خوش اعتقادی کی انتہاؤں کو چھو سکتا تھا مگر مَیں نے اپنے کو ایک امتحان میں مبتلا پایا اور اس میں کامیابی و سرخروئی کا راستہ میں نے یہی محسوس کیا کہ اس کتاب کو ایک ذمہ دار مورخ اور تذکرہ نگار کے احساس کے ساتھ لکھا اور نبا ہا جائے۔ میری درخواست مذہبی شخصیات پر قلم اٹھانے والوں سے یہ ہوگی کہ وہ اس سلسلے میں میری مثال سے فائدہ اٹھائیں۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں مفتی صاحب قدس سرہٗ کے صاحبزادگان اور اہلِ خانہ نے میرے ساتھ پورا تعاون کیا ہے۔ بعض دیگر احباب نے بھی معاونت فرمائی ہے۔ مَیں ان سب کا شکر گذار ہوں۔

قاضی عبدالنبی کوکبؔ

(شعبہ مخطوطات پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور)

۸، شوال المکرم ۱۳۹۱ھ

۲۷، نومبر ۱۹۷۱ء
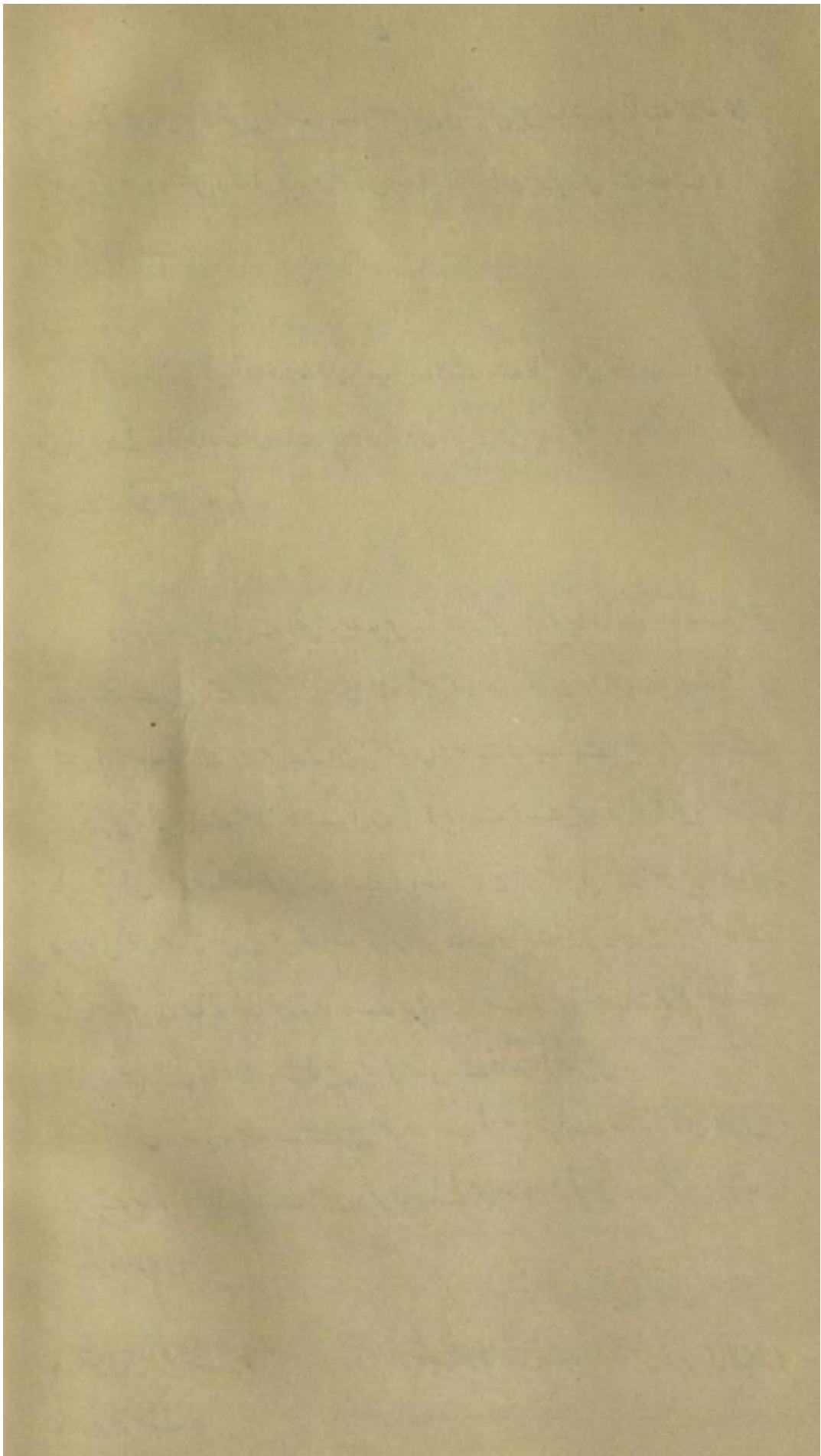
شیخ التفسیر قدس سرہٗ

(ابتدائی تعارفی مضمون)

(یہ مضمون مفتی صاحب قدس سرہٗ کے وصال سے چند روز بعد روزنامہ مشرق (۲۹ اکتوبر ۱۹۷۱ء) "جاوداں" (۳۰ اکتوبر) اور نوائے وقت میں شائع ہوا تھا۔ جسے اکثر احباب نے پسند فرمایا تھا۔ اختصار اور جامعیت کے پیش نظر اس مضمون کو کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔)

شیخ التفسیر مفتی احمد یار خان نعیمی، علمائے دین کے اس قافلے کے آخری افراد میں تھے۔ جنھوں نے موجودہ صدی کے نصفِ اوّل بلکہ ربع اوّل کی اکثر عظیم المرتبت دینی و ملّی شخصیات کو دیکھا، قریب ہو کر ان سے فیض یاب ہوئے۔ اور آگے اپنی پوری زندگی اُس مشن کی خدمت میں سرگرم رکھی، جو عظیم اسلاف سے اُن کی طرف منتقل ہوا تھا۔ مفتی صاحب مرحوم کے وصال سے ہماری ملّی تاریخ کا ایک خاص دَور سمٹتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ جس دَور کی خصوصیت یہ تھی کہ ابھی کچھ لوگ منصب و جاہ کے خیال سے بہت، دور، پورے اخلاص اور للّہیت کے ساتھ کتاب و سنت کی خدمت میں محو تھے اور سلف صالحین کی وراثت کی حفاظت انہی کے طریقِ کار کے مطابق کئے جا رہے تھے۔

مفتی صاحب مرحوم نے اپنے بچپن میں فاضل بریلوی مولانا شاہ احمد رضا خان قادری کی زیارت کی تھی۔ اور بعد میں اُن کے تلامذہ و خلفاء کی درسگاہوں میں انتہائی شوق و محنت سے علم دین کی تحصیل کی۔ مفتی صاحب کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن اوجھانی (ضلع بدایون) میں اپنے والد مولانا محمد یار خان بدایونی کے پاس ہوئی جو فارسی نصاب اور ابتدائی دینیات کی تعلیم و تربیت کے نہایت ماہر معلم تھے۔

انھوں نے مسلسل پنتالیس سال تک اپنی بستی کی جامع مسجد میں خطابت و امامت اور تبلیغ و تدریس کی خدمات انجام دی تھیں اور گھر پر نصابی تعلیم کے لئے ایک مکتب قائم کر رکھا تھا۔ جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کے بچے بھی تعلیم پاتے تھے۔ مفتی صاحب ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر نہایت چھوٹی عمر میں تحصیل علوم کے لئے وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور ۹ سال تک بدایوں اور مینڈھو میں درسِ نظامی کے اسباق پڑھتے رہے۔ مینڈھو کی درس گاہ میں دیوبندی مکتبِ فکر کے ممتاز مدرسین پڑھاتے تھے۔ اسی دور میں اپنے کسی عزیز کی ہمراہی میں مفتی صاحب کی مراد آباد کی عظیم درس گاہ جامعہ نعیمیہ (مراد آباد) کے بانی، صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی سے ملاقات ہوئی۔ صدر الافاضل مرحوم بڑے جوہر شناس انسان تھے۔ انھوں نے ہونہار طالب علم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے تمام سہولتیں مہیا فرما دیں اور مفتی صاحب کو مراد آباد سے واپس نہ جانے دیا۔ اس وقت کانپور کے علامہ مشتاق احمد مرحوم معقولات و ریاضیات کی تدریس میں یکتائے روزگار شمار ہوتے تھے۔ مولانا مراد آبادی نے وسیع مشاہرے پر، موصوف کو مراد آباد جامعہ نعیمیہ میں بلا لیا۔ اور مفتی صاحب کی اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد علامہ مشتاق احمد میرٹھ تشریف لے گئے تو مفتی صاحب بھی ان کے شاگردِ خاص کی حیثیت سے اُن کے ساتھ ہی منتقل ہو گئے۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہے کہ تحریک آزادی کے ایک نامور سپاہی، شیخ القرآن علامہ عبدالغفور ہزاروی مرحوم بھی کانپور، مراد آباد اور میرٹھ میں، علامہ مشتاق احمد سے پڑھتے رہے تھے۔ اس طرح علامہ ہزاروی، شیخ التفسیر مفتی احمد یار خان مرحوم و مغفور کے اُستاد بھائی تھے۔ مفتی صاحب مغفور خود فرمایا کرتے تھے۔ مراد آباد کا قیام میری زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ صدر الافاضل مراد آبادی کی شفقت، توجہ خصوصی، اور حکیمانہ تربیت نے مفتی صاحب کی شخصیت

پر گہرے اثرات چھوڑے تھے۔ حصول علم سے فارغ ہوکر مفتی صاحب نے تدریس اور تالیف کے کام سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کی پہلی تالیف، قانون وراثت پر "علم المیراث" کے نام سے منظرِ عام پر آئی۔ تدریس کے فرائض دھوراجی (کاٹھیاواڑ) اور اس کے بعد کچھوچھہ شریف کی خانقاہ عالیہ میں انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۹ء کے لگ بھگ مفتی صاحب مرحوم گجرات (پنجاب) میں منتقل ہوگئے۔ جہاں پیر صاحب جماعت علی شاہ کی تبلیغی انجمن خدام الصوفیہ کی گجرات شاخ کے دارالعلوم میں تدریس، تبلیغ اور تصنیف کا کام، مفتی صاحب کے سپرد ہوا۔ امیرِ ملت علی پوری، مفتی صاحب کے علم و فضل اور شوق دینی کی بنا پر اُن کے بڑے قدردان تھے۔ جب مفتی صاحب مرحوم نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "جاء الحق" تالیف کی تو پیر صاحب علی پوری کو از حد خوشی ہوئی۔ انھوں نے پوری کتاب اوّل تا آخر سُنی اور انعام و تبرکِ خاص سے مفتی صاحب کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

اس دَور میں گجرات علم و فن کے ایک خاص معیار کا حامل تھا۔ پیر ولایت شاہ، قاضی عبدالحکیم (راقم سطور کے والد) مولانا نیک عالم قادری مرحوم اور مولانا عمر بخش گجراتی مرحوم جیسے فقیر منش اور بے لوث علمار دین و صوفیار کا بابرکت گروہ موجود تھا۔ مفتی صاحب نے بھی اس عظیم دور میں خوب شوق و محنت سے خدمتِ دین کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ ایک طرف دارالعلوم میں قابل طلبہ کی ایک ٹیم تیار ہونے لگی دوسری طرف مفتی صاحب نے خطابت جمعہ اور روزانہ درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ اور تیسری طرف تصنیف و تالیف کے عظیم کام کا آغاز کردیا۔ دارالافتاء کی خدمات اس پر مستزاد تھیں۔ اسی دَور میں مفتی صاحب نے اپنی مشہور و معروف "تفسیر نعیمی" کی تالیف شروع کی۔ جس کی تقریباً آٹھ ضخیم مجلدات طبع ہوچکی ہیں (وفات سے کچھ روز پہلے، گیارہویں پارے کی آیت "الا انّ اولیاء اللّٰہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون"

کی تفسیر لکھ کر اٹھے۔ اور لاہور علاج کے لئے تشریف لائے اس کے بعد اس عظیم مفسر کا قلم ہمیشہ کے لئے رُک گیا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے بعد ان کے تلامذہ اس تفسیر کو مکمل کریں "تفسیر نعیمی" "جاء الحق" اور "علم المیراث" کے علاوہ مفتی صاحب نے متعدد دیگر کتب تالیف فرمائیں۔ جن میں "مواعظ نعیمیہ" "شان حبیب الرحمٰن" "اسرار القرآن" "سلطنت مصطفیٰ" اور "اسلامی زندگی" کے نام بہت نمایاں ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب "اسلامی زندگی" میں بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ اسلام کی معاشرتی اور تہذیبی ہدایات جمع کر دی گئی ہیں مسرفانہ رسوم اور جاہلانہ اطوار کی مذمت کی ہے اور اس کے مقابلے پر بتایا ہے کہ انسان زندگی کے مختلف مراحل میں پیش آنے والے معاملات و تقریبات کے لئے اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟

شیخ التفسیر مفتی احمد یار خان صاحب مرحوم و مغفور تقریباً پچاس برس سے تبلیغی خدمات میں سرگرم کار تھے اور ان کی تقاریر اور تصانیف میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ان میں کسی بھی مکتبِ خیال کے لئے دل آزاری کی کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ وہ عقیدتاً سُنّی تھے۔ مگر ان کا طریق کار مثبت، علمی اور حکیمانہ تھا۔ سرکار رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ، انھیں والہانہ محبت تھی۔ حضور کا ذکر مبارک آتا، تو ان کی آنکھیں بے اختیار پُرنم ہو جاتیں۔ اور آواز بھرا جاتی تھی۔ ان کے سامعین، اور صحبت میں بیٹھنے والے ہزارہا افراد، اُن کے سوز و گداز کی خصوصی کیفیت کو محسوس کرتے۔ رسول مقبولؐ کے ساتھ عشق بے تاب نے اُن کی تقریر و تحریر کا ایک مرکز و محور متعین کر دیا تھا اور وہ یہ تھا ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی، تمام بولہبی است

طبیعت فقیرانہ تھی۔ وضع اور لباس میں انتہائی سادہ اور بے تکلف رہتے تھے۔ تقویٰ اور ورع میں سلف کا نمونہ تھے۔ دل کینہ و آز سے پاک رکھتے۔ تدریس اور تالیف

کے علاوہ، اپنے وقت کا اکثر حصہ درود پاک پڑھنے میں گزارتے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک گویا ان کی غذا تھی۔ انھوں نے اپنی پچاس سالہ تبلیغی زندگی میں، شریعت مصطفوی کی تعلیمات کو عام کیا اور اتباع و محبت رسول کی مؤثر تبلیغ و تلقین فرمائی۔

شیخ التفسیر، شوال ۱۳۲۴ھ کو اوجھانی بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ اور ۳۔ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ (۲۴۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء) کو گجرات میں فوت اور مدفون ہوئے۔ ان کی قبر ان کے ذاتی مکان کے اس کمرے میں بنائی گئی ہے جہاں وہ پچھلے کئی برس سے درس قرآن دیتے تھے۔ اگرچہ مفتی صاحب مرحوم بنیادی طور پر خالص دینی اور تبلیغی میدان کے آدمی تھے، تاہم مختلف مواقع پر ملی و سیاسی تحریکات میں خدمات انجام دیتے رہے۔ تحریک پاکستان کے سلسلے میں انھوں نے اپنے استاد اور مربی صدرالافاضل مرادآبادی کی مساعیٔ تائید قرارداد پاکستان میں شمولیت کی۔ ۱۹۴۶ء میں جب پاکستان کی تائید کے لئے بنارس میں آل انڈیا سُنّی کانفرنس منعقد ہوئی تو مفتی صاحب مرحوم، پنجاب کے علماء اور مشائخ کے عظیم وفد میں شامل تھے۔ خضر کے خلاف ایجی ٹیشن کے دور میں مفتی صاحب مرحوم کے تلامذہ اور رفقاء نے بڑا کام کیا تھا۔
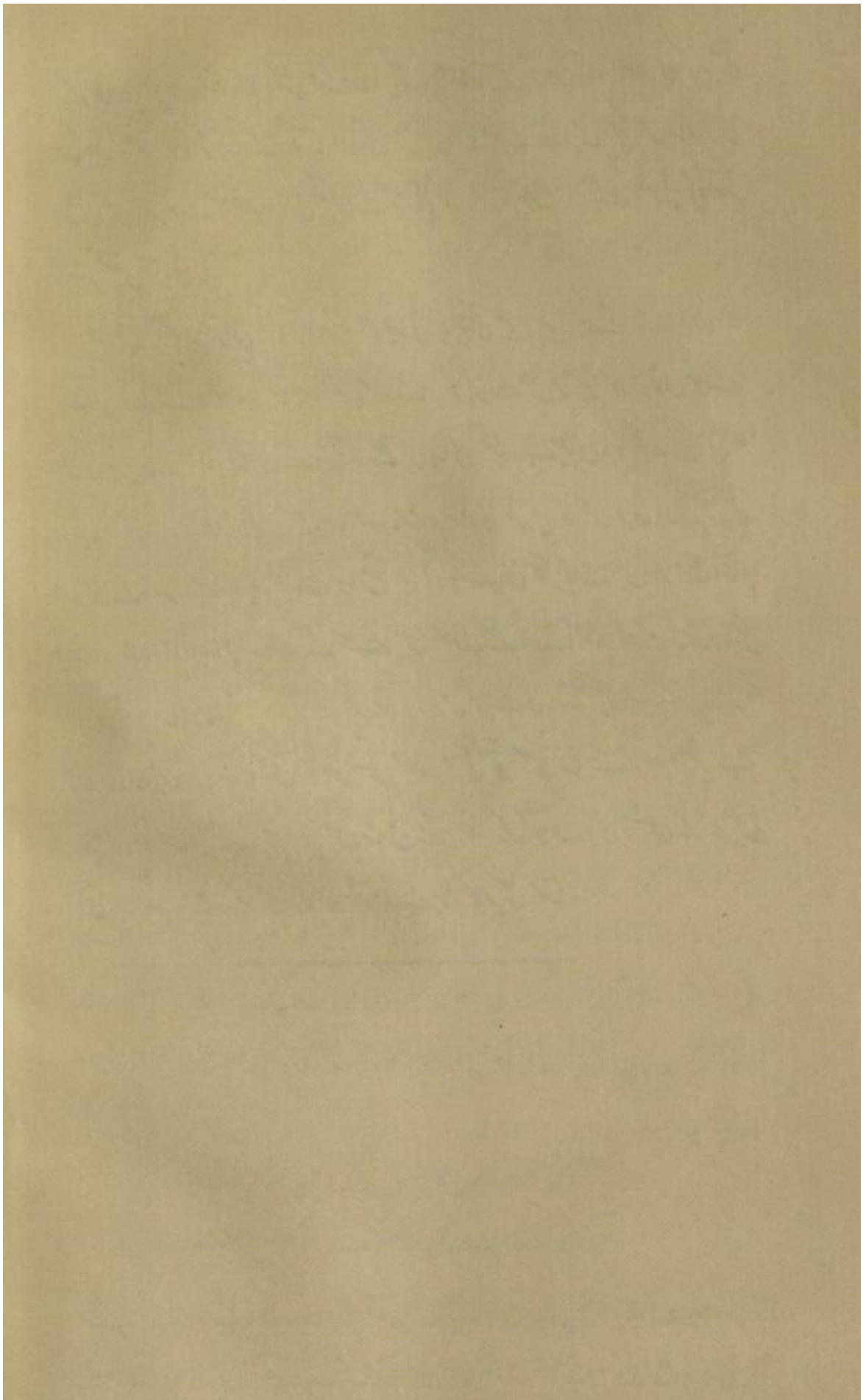
خاندانی پس منظر
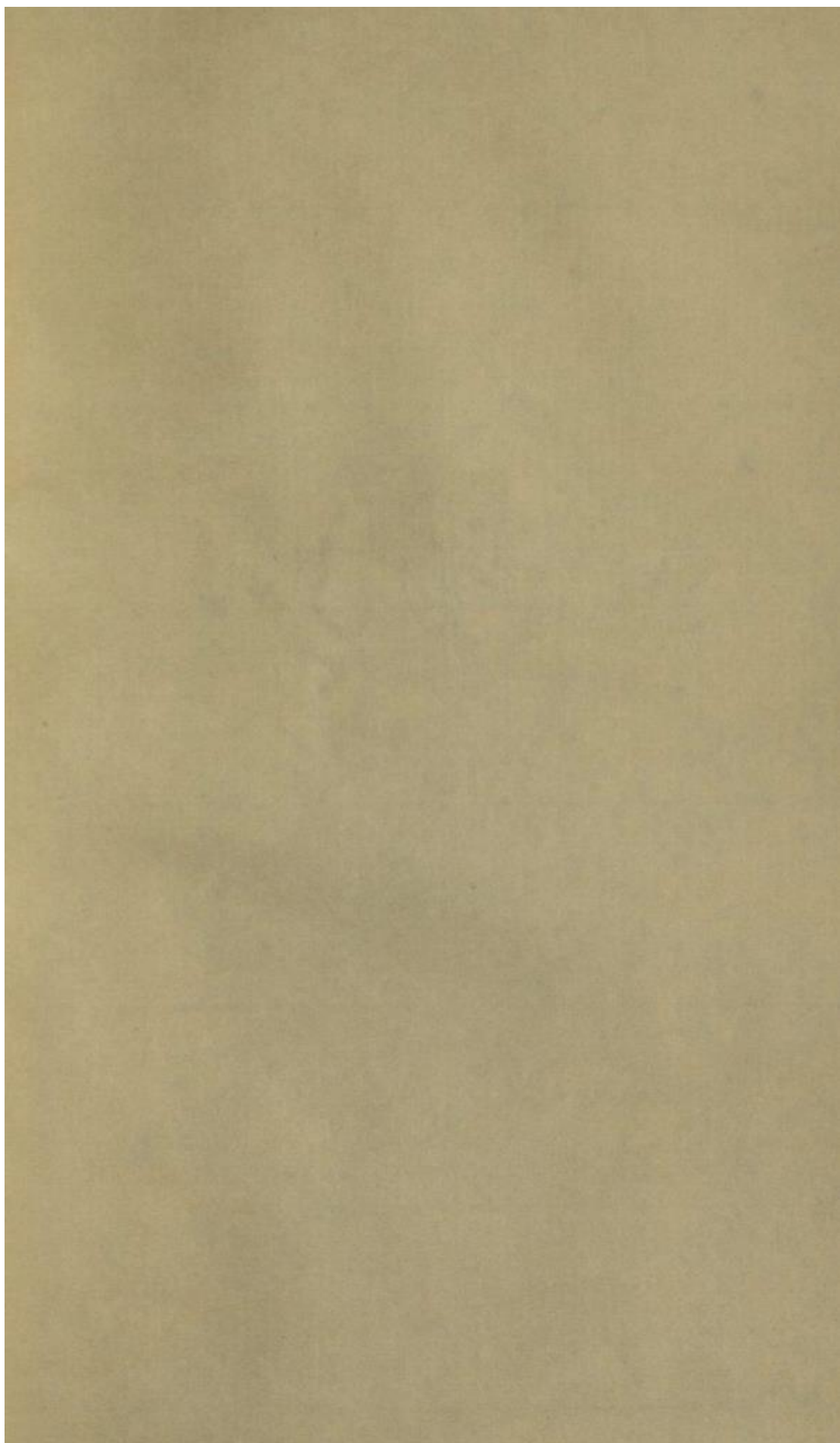
خاندانی پس منظر

مفتی صاحب قدس سرہٗ کے آباؤ اجداد اور خاندانی حالات کے بارے میں زیادہ مفصل معلومات جمع نہیں ہو سکیں[1]۔ ان کا خاندان یوسف زئی پٹھان قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کے کچھ افراد غالباً مغل دور میں افغانستان سے ہندوستان آگئے تھے۔ مفتی صاحب کے والد اور دادا سے اوپر خاندان کے دوسرے بزرگوں کے حالات معلوم نہیں ہوئے۔ دادا مرحوم منوّر خاں کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ وہ اوجھانی (بدایوں) کے معزز لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور وہ اپنے ہاں کی میونسپل کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ اہل علاقہ اپنے تنازعات کی ثالثی کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے۔

مفتی صاحب کے والد ماجد دینداری اور عبادت گذاری کی زندگی کی طرف خصوصی میلان رکھتے تھے۔ ان کا نام محمد یار تھا۔ بستی کے لوگ انہیں عام طور پر ملّاجی کہتے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر پر

---

[1] مفتی صاحب اپنے ذاتی حالات بتانے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ جب کبھی ان سے اس بارے میں کچھ تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی تو بس وہ کوئی ایک آدھ بات بتا کر رہ جاتے۔ یہ مختصر احوال جو یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔ مجھ تک تین ذرائع سے پہنچے ہیں۔ ان میں ایک بڑا حصہ ان معلومات کا ہے جو میں مفتی صاحب سے ان کے ہسپتال کے ایام میں (آخری آپریشن کے موقع پر) براہِ راست حاصل کرتا رہا۔ اسکے بعد ان احوال میں دوسرا بڑا حصہ مفتی صاحب کے بڑے صاحبزادے مفتی مختار احمد صاحب کی وساطت سے معلوم ہوا۔ اسی طرح اس سلسلے کی بہت سی باتیں مفتی صاحب کی بڑی ہمشیرہ محترمہ مدظلہا سے بھی منقول ہیں (باقی ۱۹ پر)

فارسی کی ابتدائی نصابی تعلیم کا مکتب قائم کر رکھا تھا جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو خاندانوں کے بچّے بھی پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ اس طرح بستی کی ہندو آبادی کی اکثریت ان کی شاگرد بن چکی تھی اور سب لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ بستی کا ایک رئیس لالہ رائے بخت بہادران کا شاگرد رہ چکا تھا۔ اور اس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس نے دلی طور پر اسلام قبول کر لیا ہوا تھا اور یہ کہ وہ چھپ چھپا کر نماز بھی پڑھا کرتا تھا۔

مکتب میں تعلیم پانے والے بچوں کے سرپرستوں کی طرف سے مُلّاجی کی کچھ خدمت کر دی جاتی تھی۔ اسی پر ان کا اور ان کے خاندان کا گذارہ چلتا تھا۔ مکتب کی مصروفیت کے بعد ملّاجی کی دوسری بڑی مصروفیّت مسجد کی خدمت تھی۔ انہوں نے اوجہانی کی جامع مسجد کی امامت، خطابت اور انتظامی امور سب کچھ اپنے ذمے لے رکھا تھا اور یہ خدمات انہوں نے مسلسل پینتالیس برس تک انجام دیں۔ مسجد کی کسی خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ حتیٰ کہ مختلف مواقع پر بحیثیت امام مسجد انہیں جو کھانے یا کپڑے بھیجے جاتے تھے وہ انہیں قبول نہیں کرتے تھے اور ہدایت کر دیتے کہ یہ چیزیں بستی کے مستحقین تک پہنچا دی جائیں۔ بازار جاتے تو محلّے کی خواتین خاصکر بیوگان سے دریافت کر کے انہیں بھی سودا سلف لا دیتے۔ اہلِ محلّہ کے بچوں کے اخلاقی ماحول کی نگرانی بھی کرتے رہتے۔ ضرورت پڑتی تو حکیمانہ انداز میں اصلاح کی تدبیر نکالتے۔ عید کے دن وہ بہت سی ریزگاری لے کر بچوں میں بانٹنے کے لئے بیٹھ جاتے۔ مگر بڑی عمر کے آدمی بھی ملّاجی کا تبرک حاصل کرنے کے لئے یہ کہتے ہوئے آجاتے کہ "چلیئے آج تو ملّاجی پیسے بانٹ رہے ہیں۔"

مسجد کے ساتھ انہیں ایسا تعلق پیدا ہو گیا تھا کہ آخری ایّام میں کسی عارضے کے باعث ان کی کیفیت یہ تھی کہ دن میں کئی دفعہ ان کا جسم اچانک سن ہو جاتا اور اگر چلتے ہوتے تو لڑکھڑا کر

(بقیہ ص۱۷ کے) اوجہانی ضلع بدایوں (یوپی) کی ایک بستی کا نام ہے مفتی صاحب بتاتے تھے اوجہانی بدایوں شہر سے تقریباً ساڑھے سات میل کی مسافت پہ تھا۔ سہسوان کے لئے بھی اوجہانی کے ریلوے اسٹیشن پر اترنا پڑتا تھا۔

گر پڑتے۔ مگر اس ضعف و عارضہ کے باوجود وہ مسجد میں مسلسل حاضر ہوتے جس کے نتیجے میں بار بار مسجد کی سیڑھیوں سے گر پڑتے۔ چنانچہ وفات کے بعد جب انہیں غسل دیا جارہا تھا تو دیکھا گیا کہ سارا جسم زخموں سے اور چوٹ کے نشانات سے بھرا ہوا تھا۔ جنازہ اٹھا تو بستی کی تمام آبادی ساتھ چل رہی تھی اور ہندوؤں کا اصرار تھا کہ انہیں بھی کندھا دینے کا موقع دیا جائے۔ مرحوم کی خواہش تھی کہ انہیں مسجد کے ساتھ ملحقہ شاملات میں دفن کیا جائے مگر بعض اہل قرابت نے اس بات کو پسند نہ کیا۔ اس لئے انہیں بستی کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

زندگی کا جو نقشہ مفتی صاحب کے والد مرحوم کے حالات میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ عسرت اور تنگدستی کا رنگ، بالعموم اس نقشے کی زینت ہوتا ہے۔ اس گھر کے حالات بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہ تھے۔ اس کے باوجود ان کی طبیعت درویشانہ تھی اور استغنا کا پہلو مزاج پر غالب تھا۔ آگے چل کر مفتی صاحب کی دھوراجی (کاٹھیاواڑ میں) تدریس کے ایام پر ہم مفصل لکھیں گے دھوراجی سے مفتی صاحب ہر مہینے کچھ نہ کچھ رقم گھر بھیجتے رہتے تھے، چند سالوں کے بعد جب وطن واپس آئے تو جاننا چاہا کہ ان رقوم کے سلسلے میں آمد و خرچ کا کیا حساب رہا۔ اس پر والدہ نے کہا "حساب کیا بتایا جائے، تم اپنے والد کی طبیعت سے آگاہ ہو۔ بس یہ جان لو کہ گھر میں پڑا ہوا کچھ نہیں جو آیا خرچ کر دیا گیا"۔ اور اس کے بعد والدہ نے یہ کہہ کر مفتی صاحب کو مطمئن کر دیا "تم ان کا حساب نہ لو قیامت کے روز ان شاء اللہ تمہارا حساب نہ ہوگا۔"

مفتی صاحب کی والدہ ماجدہ نے اپنے خادم دین شوہر کے کام میں ہاتھ بٹانے کا طریقہ یوں نکال لیا تھا کہ وہ اپنے گھر کے کام کاج سے فرصت نکال کر محلے اور بستی کی عورتوں اور بچیوں کو قرآن پاک ناظرہ پڑھاتی تھیں۔ گھر کی مصروفیات اور ذوق و شوقِ عبادت کے بعد ان کی زندگی کی واحد آرزو یہ تھی کہ سفر حج پہ جائیں اور اپنی آنکھیں مدینہ منورہ اور روضۂ رسول کی زیارت سے ٹھنڈی کریں۔

چنانچہ جب ان کے اکلوتے بیٹے (مفتی صاحب) نے انہیں سفرِ حرمین پر ساتھ لے جاکر ان کی یہ تمنا پوری کردی تو وہ اپنے فرزند سے بے حد راضی ہوئیں اور انہوں نے روضۂ اطہر کی جالیوں کے سامنے بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ ان کے بیٹے کو خصوصی طور پر الطافِ خسروانہ سے نوازا جائے۔ ان کے اپنے الفاظ اس کتاب کے کسی آئندہ باب (ہسپتال کی ڈائری) میں نقل کیے جائیں گے۔ اُن کے الفاظ اور اُن کے اندازِ تخاطب سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں حضور کی ذاتِ کریم سے کس قدر والہانہ وابستگی تھی۔

یہ تھے مفتی صاحب مرحوم کے والدین ان کے ہاں یکے بعد دیگرے پانچ لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں۔ پانچویں بچی کے بعد والدنے اللہ تعالےٰ کے حضور میں اولادِ نرینہ کے لئے خاص دعا مانگی اور ساتھ یہ نذر مانی کہ اگر لڑکا پیدا ہوا تو اسے اللہ اور اس کے رسول کے راستے میں بسلسلۂ خدمتِ دین وقف کردوں گا۔ یہ دعا قبول ہوگئی اور ان کے گھر میں یہ ہونہار بچہ پیدا ہوا جس کا نام احمد یار رکھا گیا۔ والد نے اپنی نذر کے مطابق اس بچے سے علمِ دین کے حصول کے علاوہ اور کوئی کام نہ لیا اور اس بچے نے بھی آگے چل کر اپنی عملی زندگی سے یہ ثابت کردیا کہ واقعی وہ احمد یار تھا اور واقعی وہ اس قابل تھا کہ اسے اللہ اور اس کے رسول کے راستے میں وقف کیا جاتا۔

طالب علمی
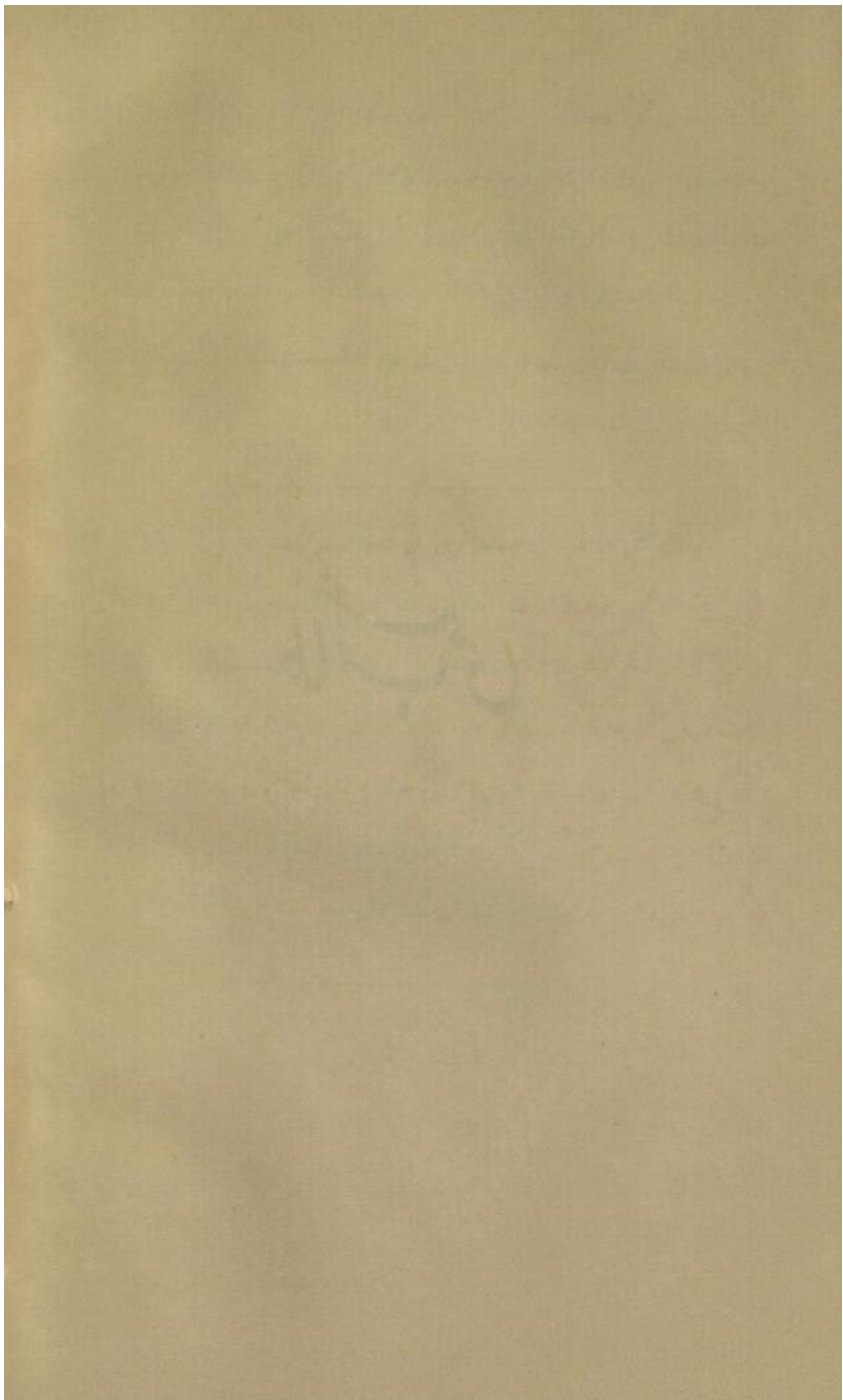
طالب علمی

مفتی صاحب گیارہ[1] برس کی عمر میں تحصیل علم کے لئے وطن سے باہر نکلے اور بیس[2] برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ ادھر ابتدائی دور میں تقریباً چار پانچ برس تک اپنے والد ماجد کے پاس بھی پڑھتے رہے۔ اس طرح ان کی طالب علمی کا کل زمانہ کوئی تیرہ چودہ سال کی مدت پر مشتمل معلوم ہوتا ہے جس میں اوجھانی، بدایوں شہر، مینڈھو، مراد آباد اور میرٹھ ان پانچ مقامات پر آپ کا دور طالب علمی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

وطن اوجھانی میں آپ نے اپنے والد ماجد سے قرآن مجید پڑھا اور اس کے بعد فارسی کی نصابی تعلیم نیز دینیات اور درس نظامی کے آغاز کی کتب کی تعلیم بھی انہی سے پائی۔ یہ مفتی صاحب کی طالب علمی کا پہلا دور ہے، جس کا سلسلہ غالباً چھ سات برس کی عمر سے شروع ہوا ہوگا، البتہ یہ بات بالیقین معلوم ہے کہ گیارہ برس کی عمر میں اس دور کا اختتام ہو گیا تھا۔

مفتی صاحب کی طالب علمی کا دوسرا دور بدایوں شہر میں گذرا جہاں آپ گیارہ برس کی عمر میں (یعنی تقریباً ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء میں) آکر مدرسہ[3] شمس العلوم میں داخل ہوئے، اس مدرسے

---

[1] گیارہ برس کی عمر کا یہ تعین مفتی عزیز احمد صاحب بدایونی کے بیان پر مبنی ہے۔ علاوہ ازیں طالب علمی کے زیر عنوان درج ہونیوالی اکثر معلومات مجھ تک مفتی صاحب موصوف دامت برکاتہ کی طرف سے پہنچی ہیں۔ [2] یہ بات مفتی صاحب مرحوم نے مجھے خود بتائی تھی کہ فارغ التحصیل ہونے کے وقت ان کی عمر بیس سال کی تھی جب آپ کی دستار بندی کی تقریب منعقد ہو رہی تھی (باقی صـ۲۳ پر)

میں آپ تین سال تک (یعنی ۱۳۳۵ھ تا ۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۹ء) پڑھتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شمس العلوم بدایوں میں علامہ قدیر بخشؒ بدایونی مدرس تھے۔ مفتی صاحب ان کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ انؔ دنوں مفتی عزیز احمد صاحبؒ بدایونی اسی دارالعلوم میں درسِ نظامی کے آخری اسباق پڑھ رہے تھے اور جیسا کہ بالعموم مدارسِ عربیہ میں مبتدی طلبہ کے بعض اسباق منتہی طلبہ کے سپرد کئے جانے کی روایت رہی ہے، اسی کے مطابق مفتی صاحب مرحوم نے یہاں صرف ونحو کے کچھ ابتدائی سبق مفتی عبدالعزیز صاحب سے بھی پڑھے۔

مدرسہ شمس العلوم کے جس کمرے میں مفتی صاحب کو جگہ ملی تھی اس میں دوسرے بہت سے طلبہ بھی رہائش پذیر تھے اور اکثر شور و شغب کا ماحول بنا رہتا جس سے مفتی صاحب کو پریشانی ہوتی۔ اس سلسلے میں ایک دفعہ ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جو اُس دَور کا یادگار واقعہ بن گیا۔ ایک رات طالب علموں نے اس قدر غل غپاڑہ مچایا اور اتنی دیر تک ہنگامہ آرائی جاری رہی کہ مفتی صاحب اپنے اسباق کا مطالعہ بالکل نہ کر سکے۔ صبح علامہ قدیر بخش (رحمہ اللہ) کی کلاس میں نحو میر کا سبق پڑھنے بیٹھے تو انتہائی توجہ اور یکسوئی کی کوشش کے باوجود سبق کی قطعاً سمجھ نہ آئی۔ استاذِ علاّم سبق کی تقریر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور مفتی صاحب شروع کے حصے کی سمجھ نہ پڑنے پر پیچ و تاب کھا رہے تھے

(بقیہ حاشیہ ص۲۳) اس موقع پر مفتی صاحب کے چچازاد بھائی جناب عزیز خاں مرحوم نے فارسی زبان میں یہ قطعۂ تاریخ تحریر فرمایا تھا ؎

شدہ فارغ از علم دیں شکر حق را　　چو احمد کہ با یار و خان است منضم
بگفتم لَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِیْماً　　بہ نوکِ زباں گوہر سال سفتم

۱۳ ھ ۴۴

آخری مصرعے میں آیت کریمہ سے تیرہ سو چوالیس　کے عدد برآمد ہوتے ہیں اور یہی آپ کے فارغ التحصیل ہونے کا سال ہے۔

۳ھ مدرسہ شمس العلوم بدایوں کے معروف مدارس میں شمار ہوتا ہے۔ تقسیم کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں اس مدرسے پر ہندو بلوائیوں نے خشت باری کی ۱۹۶۳ء میں اس مدرسے کے شیخ الحدیث مفتی محمد ابراہیم تھے۔ دیکھئے "بدایوں ۱۹۴۷ء میں" مولفہ محمد سلیمان بدایونی۔ مدرسہ شمس العلوم کی بنیاد ——— مولانا عبدالماجد بدایونی نے رکھی تھی (بقیہ ص۲۵ پر)

بالآخر مفتی صاحب بے اختیار رو پڑے۔ استاذِ محترم نے یہ منظر دیکھا تو فرمانے لگے :۔

"احمد یار یہ کیا ماجرا ہے۔ آخر خود کردہ را علاج نیست مطالعہ بھی نہیں کیا؟ اور سبق سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہو؟"

اس کے ساتھ ہی حضرت علامہ نے اسباق میں باوضو بیٹھنے کی رغبت دلائی۔ استاذِ علام کی یہ نگاہِ کشف و بصیرت دیکھ کر مفتی صاحب تصویرِ حیرت بن کر رہ گئے۔ دل میں طے کیا کہ آئندہ کلاس میں باوضو آنے کی کوشش کی جائے گی اور اس کے بعد رات کا وہ سارا ماجرا استاذِ محترم کو سنا دیا جو مطالعہ نہ کر سکنے کا باعث بنا تھا۔ حضرت علامہ قدیر بخش نے اسی وقت ہدایات جاری کر دیں کہ احمد یار خاں کے لئے فوری طور پر الگ کمرے میں رہائش کا انتظام کیا جائے اور اس کمرے میں دوسرا طالب علم عزیز احمد بدایونی احمد یار کے ساتھ رہے اس نئے انتظام سے مفتی صاحب کی تمام پریشانیاں دور ہو گئیں، شور و غل سے نجات ہوئی اور مزید لطف یہ کہ مفتی عزیز احمد صاحب جیسے منتی اور سمجھدار طالب علم کی رفاقت بھی مہیا ہو گئی۔ اس دور میں مفتی صاحب نے خوب دل لگا کر مسلسل محنت اور شوق سے علم حاصل کیا۔

مفتی عزیز احمد صاحب بدایونی کے بیان کے مطابق مفتی صاحب مرحوم اپنے عہد طالب علمی

(بقیہ حاشیہ صـ۲۴) [1] مفتی عزیز احمد صاحب مدظلہٗ اس وقت ہمارے علماء میں ایک محترم اور بزرگ شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں وہ ۱۹۰۲ء میں آنولہ (بریلی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ محمدیہ بدایوں میں پائی۔ پھر شمس العلوم میں مولانا احمد الدین سواتی (خیری ریاست سوات) مولانا شاہ محمد ابراہیم بدایونی اور مولانا واحد حسین بدایونی (تلمیذ علامہ برکات ٹونکی) سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ فراغت پر مدرسہ قادریہ بدایون میں مدرس مقرر ہوئے، گونانہ چھاؤنی (ریاست گوالیار) اور جھنیز (پٹنہ) میں بھی مدرس رہے جب مفتی صاحب ریاست گوالیار میں تھے تو شدھی کی تحریک زوروں پر تھی۔ انہوں نے اس موقعے پر اپنے علاقے میں تبلیغی جلسوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ مفتی صاحب ۱۹۲۳ء میں لاہور آ گئے تھے اور جب سے گڑھی شاہو میں مقیم ہیں۔ وہاں مسجد عید گاہ و دارالعلوم جامعہ نعیمیہ میں خطابت پنجگانہ آپ ہی کرتے ہیں۔ استاذِ گرامی مفتی احمد یار خاں قدس سرہٗ مفتی صاحب کو اپنے واجب الاحترام بزرگوں میں شمار کرتے تھے جب میں گجرات سے لاہور منتقل ہونے لگا تو مجھے فرمایا: "لاہور میں تین شخصیتوں کی خدمت میں حاضر ہوتے رہنا۔ سید معصوم شاہ صاحب (رحمہ اللہ) مفتی عزیز احمد صاحب اور سید ابو البرکات صاحب"۔

ہیں اسباق کے مطالعہ اور تکرار کے ازحد پابند تھے، وہ ہمیشہ کافی رات گئے تک آئندہ صبح کے اسباق کا مطالعہ دیکھتے اور استاذ کی کلاس سے فارغ ہونے کے بعد اپنے رفقاء کے ساتھ سبق کے اعادہ و تکرار کے لئے بیٹھ جاتے۔ جس میں وہ استاذ کی تقریر سبق کو بتمام و کمال دہرا دیتے۔ اس کے بعد وہ سوالات و جوابات بھی پوری تفصیل کے ساتھ سناتے۔ اس پر مزید یہ کہ اکثر اوقات نئے اعتراضات اور ان کے جوابات اپنی طرف سے بھی ساتھی طالب علموں کے سامنے پیش کرتے اور کوئی بات الجھن پیدا کر دیتی تو استاذ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسے رفع کرا لیتے۔ اگر مفتی صاحب کی اپنی پیش کردہ کوئی بات استاذ محترم کے ہاں غلط قرار دی جاتی تو مفتی صاحب اپنے ساتھیوں میں اگر اس بات کی نشاندہی کرتے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے۔ مفتی صاحب اس سلسلے میں کہا کرتے:-

"میں جب تک اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کر لیتا اس وقت تک
میرے دل و دماغ میں ایک ہیجانی کیفیت برپا رہتی ہے۔"

مفتی عزیز احمد صاحب کی رفاقت مفتی صاحب مرحوم کے لئے بڑی عزیز اور ناگزیر بن گئی تھی ان کے سوا ہم سبق طلبہ میں ایسا کوئی نہ تھا جسے اسباق کے مطالعے اور تکرار و اعادہ کا ایسا بے پناہ شوق ہوتا جیسا کہ ان میں تھا مگر مفتی عزیز احمد صاحب کے اوقات[1] ایک دوسری مصروفیت میں صرف ہونے لگے۔ وہ یہ کہ انہیں مولانا شاہ عبدالقدیر[2] کے صاحبزادے عبدالہادی[3] (عرف محمد میاں) کی تعلیم کا کام بھی سونپ دیا گیا اور اسی سلسلے میں مفتی عزیز احمد صاحب کو اکثر و بیشتر سفر پر بھی جانا پڑتا۔ مفتی صاحب مرحوم کے لئے یہ صورتِ حال کافی حد تک باعثِ حرج بن گئی اور بالآخر وہ مدرسہ بدایون کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ مفتی عزیز احمد صاحب کے بیان کے مطابق مفتی صاحب

---

[1] مولانا شاہ عبدالقدیر بدایونی رحمہ اللہ تعالےٰ، حضرت تاج الفحول محب رسول مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی قدس سرہ العزیز کے صاحبزادے تھے نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی صدر الصدور کے بعد انہیں ریاست حیدرآباد کا مفتی مقرر کیا گیا۔ مفتی عزیز احمد بدایونی مولانا عبدالقدیر کے بڑے بھائی، مولانا عبدالمقتدر بدایونی قدس سرہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ اس لئے اس خاندان کے ساتھ وہ علاقہ ارادت رکھتے ہیں۔ [2] مولانا عبدالہادی، محمد میاں نے بعد میں اعلےٰ تعلیم الہ آباد یونیورسٹی میں پائی۔ وہ آج کل جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں فائز پروفیسر ہیں۔

قدس سرہٗ بدایون کے مدرسہ شمس العلوم میں تین برس تک پڑھتے رہے اور ان کے اسباق نورالانوار تک پہنچ گئے تھے۔

بدایون کی طالب علمی کے دوران میں ہی مفتی صاحب اعلیٰحضرت بریلوی قدس سرہ العزیز کی خدمت میں حاضری کے لئے بریلی تشریف لے گئے۔ خود مفتی صاحب مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ "میں ایک دفعہ اعلیٰحضرت کو دیکھنے کیلئے بریلی شریف حاضر ہوا تھا۔" میرے سوال پر آپ نے فرمایا۔ "میری عمر اس وقت کوئی دس بارہ برس کے لگ بھگ ہوگی اور میں بدایوں سے گیا تھا۔" اس کے بعد مزید ارشاد فرمایا۔ "اُن دنوں ۲۷ ر رجب قریب تھی اور اعلیٰحضرت کے ہاں تقریب معراج کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ آپ اس تقریب کے لئے بڑا اہتمام فرماتے، مہمانوں کی کثیر آمد ہوتی اور ان کے کھانے اور قیام کے انتظامات کی خود نگرانی کرتے۔ اس مصروفیت کے باعث میں صرف ایک مجلس میں حاضری نصیب ہوسکی جس میں اعلیٰحضرت کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔" اب مفتی عزیز احمد صاحب سے بھی اس بات کی تصدیق ہوگئی ہے کہ بدایون کے دَور میں ہی مفتی صاحب بریلی گئے تھے اور اعلیٰحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

بدایون کے بعد مفتی صاحب قدس سرہٗ کی طالب علمی کا تیسرا دَور ریاست مینڈھو میں گذرا، یہاں والیانِ ریاست کے اہتمام سے ایک دارالعلوم قائم تھا جس کے نظم و نسق اور تعلیمی ماحول کے بارے میں آس پاس کے علاقوں میں اچھی رائے پائی جاتی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کے اس مدرسے میں ملک کے ممتاز فاضل اساتذہ کو تدریس کے لئے بلایا جاتا تھا چنانچہ جیسا کہ آگے چل کر ہم اس کتاب میں حضرت علامہ قاضی عبدالسبحان قدس سرہٗ کے تذکرے میں بیان کریں گے، غورغشتی کیمبل پور کے مشہورِ زمانہ عالم استاذالعلماء حضرت علامہ قطب الدین غورغشتوی کو بھی کچھ عرصے کے لئے ریاست مینڈھو میں بسلسلہ تدریس بلایا گیا تھا جس دَور میں مفتی صاحب مرحوم مینڈھو

کے مدرسے میں پڑھتے رہے ہیں۔ اُس دَور کے اساتذہ و مدرسین کے بارے میں تفصیلات معلوم نہیں ہوسکتیں۔ مفتی عزیز احمد صاحب کے بیان کے مطابق یہ مدرسہ اس وقت دیوبندی مسلک کا حامل تھا اور مفتی صاحب مرحوم پر اس مدرسے کی طالب علمی کے اثرات پڑے تھے۔ خود مفتی صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے: "دیوبندی اساتذہ کے پاس ایک عرصہ تک پڑھنے سے میں یہ سمجھنے لگ گیا تھا کہ علمی تحقیق کا کمال تو بس اسی گروہ میں پایا جاتا ہے لیکن جب صدرالافاضل قدس سرہٗ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے مجھے اعلیٰحضرت کا ایک رسالہ: "عطایا القدیر فی احکام التصویر" مطالعے کیلئے دیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی"۔ مذکورہ بالا تاثر کا تعلق میینڈھو کے دَورِ طالب علمی ہی سے ہے۔ میینڈھو میں قیام کا دور غالباً تین چار برس پر مشتمل ہوگا اور یہ زمانہ ۱۳۳۹ھ تا ۱۳۴۱ھ (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۲ء) کے لگ بھگ ہونا چاہیئے۔

مفتی صاحب کے والد مسلک اور عقیدے کے اعتبار سے کٹر سنی حنفی تھے۔ انہیں مفتی صاحب کا میینڈھو کے مذکورہ مدرسے میں پڑھنا' ناپسندیدہ محسوس ہونے لگا تھا۔ چنانچہ ایک بار جب سالانہ تعطیلات کے موقعہ پر مفتی صاحب گھر آئے ہوئے تھے تو گھر والوں کے احساسات کا اندازہ ہوا۔ مفتی عزیز احمد صاحب کا بیان ہے کہ اُسی دَور میں ان کی بھی ایک ملاقات مفتی صاحب مرحوم سے ہوگئی۔ جس میں بعض مسائل اختلافیہ پر بھی گفتگو چھڑی اور انہوں نے حنفی بریلوی مشرب کے مطابق مفصل دلائل پیش کئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اتفاق یہ پیش آیا کہ مفتی صاحب مرحوم کے ایک چچازاد بھائی جن کی مراد آباد میں ملازمت تھی۔ وہ بھی گھر آئے ہوئے تھے اور اب مراد آباد واپس جا رہے تھے۔ انہوں نے مفتی صاحب پر زور ڈالا کہ آپ میرے ساتھ مراد آباد چلیں اور وہاں مولانا نعیم الدین مراد آبادی سے ملاقات کریں۔ چنانچہ مفتی صاحب مراد آباد پہنچے۔

مراد آباد جامعہ نعیمیہ میں مفتی صاحب کی ملاقات حضرت صدرالافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی سے ہوئی تو

توحضرت صدرالافاضل نے دریافت فرمایا :

"مولانا ! کون سے اسباق پڑھتے ہیں آپ"

مفتی صاحب نے اپنے اسباق بتائے تو صدرالافاضل فرمانے لگے :

"کیا آپ ان اسباق کا امتحان دے سکتے ہیں"

مفتی صاحب امتحان کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ حضرت صدرالافاضل سوالات کرتے گئے اور مفتی صاحب جوابات دیتے گئے۔ آخر میں بعض سوالات مفتی صاحب نے بھی حضرت صدرالافاضل پر کیے۔ اور ان کے شافی جوابات حاصل کئے۔ مفتی صاحب نے اپنے سامنے علم وحکمت کا دریا موجزن پایا تو ادھر صدرالافاضل قدس سرہٗ نے بھی اس نوعمر مگر فاضل طالب علم میں جوہر قابل تاڑلیا۔ علم و فلسفہ کی طویل اور دقیق گفتگو کے بعد صدرالافاضل نے فرمایا :۔

"بھئی مولانا ! علم کے ساتھ حلاوتِ علم بھی ہو تو استقامت عطا ہوتی ہے اور انشراحِ صدر کی دولت ملتی ہے۔"

مفتی صاحب نے دریافت کیا : "حلاوت علم سے مُراد ؟"

حضرت نے جواب میں فرمایا :

"حلاوتِ علم تو حضور علیہ السلام کی ذات سے نسبت قائم رکھنے سے ہی حاصل ہوسکتی ہے لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی ۔"

یہ باتیں مفتی صاحب کو اپنے دل ودماغ کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔

حضرتِ صدرالافاضل قدس سرہ العزیز کے ساتھ یہ ملاقات مفتی صاحب کی زندگی میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد مفتی صاحب مرادآباد جامعہ نعیمیہ میں داخل ہوگئے۔ اور حضرت صدرالافاضل نے مفتی صاحب کو ان کے مطلوبہ معقولات کے اعلیٰ اسباق شروع کرادیئے اسباق شروع تو کرادیئے مگر حضرت کی گوناگوں مصروفیات اُن کے پاس فراغت اور سکون کے

لمحات کم ہی چھوڑتی تھیں۔ نتیجۃً اسباق میں ناغے ہونے لگے۔ تنگ آکر مفتی صاحب ایک بار مرادآباد سے نکل کھڑے ہوئے۔ صدر الافاضل کو علم ہُوا تو انہوں نے آدمی بھجوا کر مفتی صاحب کو واپس بلوایا اور طے کیا کہ آئندہ مفتی صاحب کی تعلیم کا حرج نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اس کا طریقہ اس کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا کہ چوٹی کا کوئی مدرس مستقل طور پر دارالعلوم میں موجود ہو۔ چنانچہ حضرت صدر الافاضل نے حضرت علامہ مشتاق احمد کانپوری[1] سے رابطہ قائم کیا جو اپنے وقت میں معقولات کے امام اور نہایت اونچے پائے کے استاذ شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے یہ شرط پیش کی کہ میرے ساتھ میرے اُن تمام طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام بھی آپ کے ذمے ہوگا جو اس وقت میرے پاس اسباق پڑھ رہے ہیں۔ حضرت صدر الافاضل نے یہ شرط منظور فرمالی اور حضرت علامہ کانپوری کو جامعہ نعیمیہ مرادآباد میں بلا لیا گیا۔ مفتی صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں حضرت علامہ کا مشاہرہ اسّی روپیہ مقرر ہُوا تھا۔ علامہ کانپوری کی آمد سے مفتی صاحب کی طالب علمی کا ایک نرالا دَور شروع ہُوا۔ استاذ اپنے دور کا مانا ہُوا معلّم و امام اور شاگرد اپنے وقت کا ذہین ترین اور شوقین ترین طالب علم۔ اس کے ساتھ مزید یہ کہ شاگرد کو ہر گھڑی یہ احساس کہ یہ علامۂ زمان استاذ محض میری تعلیم کی خاطر یہاں بلائے گئے ہیں اور بہر نوع استاذِ گرامی کو بھی یہ بات ملحوظِ خاطر لازماً رہتی ہوگی کہ یہ وہ لڑکا ہے جس کے لئے ہمیں کانپور سے کھینچ لایا گیا ہے۔

حضرت علامہ مشتاق احمد جس وقت مرادآباد تشریف لائے ہیں یہ عربی مدارس کے تعلیمی سال کا درمیان تھا یعنی رمضان کے بعد نئے داخلے ہو کر کچھ مدت گزر چکا تھا اور طلبہ کے اسباق شروع ہو چکے تھے۔ یہی باعث تھا کہ علامہ نے اپنے مرادآباد منتقل ہونے کو مشروط کیا کہ میرے طلبہ جن کے سبق شروع ہو چکے ہیں میرے ساتھ رہیں گے۔ درمیان سال انہیں چھوڑ کر میں کہیں نہیں جا سکتا۔ حضرت علامہ نے مرادآباد

---

[1] علامہ مشتاق احمد کانپوری کا خاندان علم و فضیلت میں ممتاز تھا۔ ان کے بڑے بھائی مولانا نثار احمد کانپوری اردو زبان کے بلند پایہ خطیب شمار ہوتے تھے اور انہیں بلبل ہند کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ افسوس کہ نزھۃ الخواطر جیسی کتب تذکرہ میں ان لوگوں کے احوال درج نہیں کئے گئے۔

جامعہ نعیمیہ میں اس سال کا بقیہ حصّہ پورا کیا مگر اگلے سال انہیں میرٹھ میں بڑے اصرار کے ساتھ بلایا جا رہا تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر علّامہ مشتاق احمد کانپوری نے حضرت صدر الافاضل سے یہ کہہ کر اجازت حاصل کر لی کہ آپ کے اس طالب علم احمد یار خاں کو میں اپنے ساتھ میرٹھ لے جاؤں گا۔ حضرت نے یہ بات منظور فرمالی اور وقت کا یہ ممتاز قافلۂ علمی مراد آباد سے میرٹھ روانہ ہوگیا۔ مراد آباد اور میرٹھ ہی میں مفتی صاحب کی طالب علمی کا وہ زمانہ گذرا ہے جس میں شیخ القرآن ابُوالحقائق علّامہ عبد الغفور ہزاروی علیہ الرحمۃ بھی ان کے ساتھ حضرت علّامہ مشتاق احمد کے پاس پڑھتے رہے ہیں۔ علّامہ ہزاروی ان طلبہ میں شامل تھے جو کانپور سے حضرت علّامہ کانپوری کے ساتھ مراد آباد آئے تھے۔ اس طرح ہزاروی مرحوم نے کانپور، مراد آباد اور میرٹھ تینوں مقامات پر علّامہ کانپوری سے پڑھا۔ مفتی صاحب اور ہزاروی صاحب[1] بعد میں اپنی عملی زندگی کے آخری دَور میں پنجاب میں اکٹھے ہوگئے مگر ایک عرصہ تک انہیں اپنے استاذ بھائی ہونے کے حوالے سے تعارف نہ ہو سکا۔ یہ ایک سفر کا واقعہ ہے کہ ٹرین میں بیٹھے ہوئے دونوں بزرگوں کی اپنے دورِ طالب علمی پر کچھ بات چیت ہوئی تو دونوں نے اس دور کی یادوں اور نشانیوں سے ایکدوسرے کو پہچان لیا اور اٹھ کر بغلگیر ہوگئے۔ اس واقعے کی تفصیل اس کتاب کے آئندہ مضامین (ہسپتال کی ڈائری) میں آرہی ہے[2]۔ مراد آباد اور میرٹھ میں مفتی صاحب کا یہ عرصۂ طالب علمی جوان کی طالب علمی کا آخری دَور تھا مجموعی طور پر دو اڑھائی برس یا زیادہ سے زیادہ تین برس پر مشتمل ہوگا۔ بہرنوع بیس برس کی عمر میں مفتی صاحب قدس سرہٗ تعلیم سے فارغ ہوگئے۔ اس موقع پر ایک عزیز نے قطعہ تاریخ تحریر کیا جس میں مفتی صاحب

---

[1] حضرت علامہ ہزارویؒ دینیات کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بریلی میں بھی پہنچے تھے۔ اس وقت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے بڑے صاجزادے مولانا شاہ حامد رضا خاں قدس سرہٗ کا دَور تھا۔ ہزاروی صاحب نے ان کے آگے زانوئے تلمذ طے کیا۔ انہوں نے اپنے اس قابل تلمیذ کو "ابو الحقائق" کا لقب عطا فرمایا اور ان کی فراغت کے بعد انہیں جامعہ رضویہ بریلی میں صدر مدرس مقرر کیا۔ علّامہ ہزاروی کی اپنے وطن میں دوبارہ دستار بندی استاذ العلما حضرت علامہ قطب الدین غورغشتوی کے دستِ مبارک پر بھی ہوئی۔ علامہ ہزاروی مرحوم پر ایک مختصر نوٹ آئندہ اوراق میں بھی آرہا ہے۔ مفصل نوٹ اس کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں انشاء اللہ درج کیا جائے گا۔

[2] دیکھئے صفحہ ۱۰۵ پر،

کا سالِ فراغت ۱۳۴۴ھ (مطابق ۱۹۲۴ء ۱۹۲۵ء) آیہ "لَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا" سے نکالا گیا تھا[1]

طالب علمی کا یہ آخری دور، مفتی صاحب کی آئندہ زندگی پر گہرے اثرات چھوڑ گیا۔ معقولات میں مہارت و تبحّر کا سرمایہ، انہیں علامہ مشتاق احمد کانپوری سے ملا اور علومِ دین کے ساتھ خادمانہ وابستگی نیز مرکزِ دین حضور رحمۃ اللعٰلمین کے ساتھ والہانہ دلبستگی کی دولتِ دارین، مفتی صاحب نے حضرت صدر الافاضل کے منبعِ حکمت و محبت سے پائی۔ مجھے خوب یاد ہے جن دنوں ہم لوگ مفتی صاحب سے صدرا اور حمد اللہ کے اسباق پڑھتے تھے، ان دنوں میں وہ حضرت علامہ کانپوری کی یادوں کو بار بار دہرایا کرتے تھے۔ غالباً یہ اسباق مفتی صاحب نے علامہ مرحوم ہی سے پڑھے تھے۔ اور محسوس ہوتا تھا کہ تیس پینتیس برس پہلے کے گذرے ہوئے ایّام کا مکمل نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا اُس دَور کی اپنے اساتذہ کی فرمائی ہوئی مختلف اسباق سے متعلقہ تقریریں انہیں اکثر و بیشتر اب تک محفوظ تھیں۔ فرماتے تھے:۔ "ہمارے استاذ مولانا مشتاق احمد کانپوری علم و فضل میں صاحبِ مقام ہونے کے ساتھ بڑے صاحبِ دبدبہ بھی تھے۔ طلبہ کو خوب محنت کے ساتھ پڑھاتے اور سزا بھی خوب دیتے تھے۔ کبھی کبھی سزا کا اپنا ایک خاص طریقہ استعمال کرتے، وہ یہ کہ شہادت کی انگلی اور انگوٹھے میں چند چنے لے کر طالب علم کے کان میں رکھتے اور کان کی چٹکی بھر لیتے۔ کبھی کبھار زیادہ غصے کی حالت میں کتاب یا تپائی جو چیز سامنے ہوتی اٹھا کر دے مارتے۔ مگر بعد میں باندازِ شفقت فرمایا کرتے: "بیٹا میری یہ مار تمہاری زندگی کو سنوار دے گی۔" میں سمجھتا ہوں کہ اپنے استاد کا یہ رنگ طبیعت مفتی صاحب پر بھی اثر انداز ہوا تھا۔ مفتی صاحب بھی پڑھانے کے وقت سخت غصہ کرنے والے اور فوراً سزا دینے والے استاذ تھے۔ میرا شمار اچھے طالب علموں میں ہوتا تھا۔ مگر میں نے "حمد اللہ" اور "خیالی" جیسے اونچے اسباق میں بھی ایک دو بار ان سے مار کھائی اور میں تو پھر ابھی ایک بچہ تھا

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے پیچھے صفحہ ۲۳ (حاشیہ میں)

نہ ڈاڑھی نہ مونچھ۔ مفتی صاحب مرحوم تو باریشِ دراز شیوخ طلبہ کا بھی سزا کے معاملے میں لحاظ نہیں کرتے تھے مگر بعد میں جب غصہ فرو ہو جاتا تو بڑی شفقت اور دلجوئی بھی فرماتے۔ بعض اوقات صاف پتہ چلتا تھا کہ انہیں احساس ہو جاتا کہ آج میں نے زیادہ سخت سزا دی ہے۔ ایسی صورت میں اس طالب علم سے بعد میں دیر تک شفقت آمیز باتیں کرتے رہتے اور فرماتے: "میری مار تمہارے کام آئے گی اور کبھی اس دَور کو یاد کیا کرو گے۔" واقعی اب ہم اس دَور کو یاد کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ عظیم لوگ ہم سے کس قدر جلد رخصت ہو گئے ؎

حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

حضرت صدرالافاضل قدس سرہٗ نے رسمی اسباق کی شکل میں مفتی صاحب کو بہت کم پڑھایا مگر ان کی حکیمانہ نگاہ اور مومنانہ بصیرت نے مفتی صاحب کے لئے تربیت کے ایسے موثر سانچے تجویز کئے کہ ان کے دل و دماغ اور طبع و مزاج ساری شخصیت کا رنگ ہی تبدیل ہو کر رہ گیا۔ مفتی صاحب خود فرمایا کرتے تھے۔ "میرے پاس جو کچھ ہے سب حضرت صدرالافاضل کا عطا کردہ ہے۔"

مفتی صاحب کو امامِ اہل سنت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے ساتھ تعلق خاطر بھی صدرالافاضل ہی کی وساطت سے حاصل ہوا۔ صدرالافاضل نے سب سے پہلے انہیں اعلیٰ حضرت کا رسالہ "عطایا القدیر فی احکام التصویر" مطالعے کے لئے مرحمت فرمایا۔ اس رسالے میں مفتی صاحب کو فاضل بریلوی کی عظمت علمی کا پہلی بار احساس ہوا[1] اور پھر ان کے ساتھ علاقہ عقیدت زندگی کا سرمایہ بن گیا۔

مفتی صاحب نے روایت حدیث کی اجازت اور سند حضرت صدرالافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی قدس سرہٗ سے ہی پائی تھی اور آگے اپنے تلامذہ کو یہی سند عطا فرماتے تھے۔ چنانچہ راقم الحروف کی سند درج ذیل سلسلۂ اساتذہ پر مشتمل ہے جو مفتی صاحب نے دورۂ حدیث سے فراغت پر ہمیں[2] عطا کی:

---

[1] اس واقعے کے لئے اس کتاب کا صفحہ ۱۱۸ بھی دیکھئے [2] میرے ساتھ میرے محترم رفقاء (باقی صفحہ ۳۳ پر)

السیّد احمدُ طحطاوی محشی درِ مختار

السیّد محمد بن حسین الکتبی الخطیب و مفتی الاحناف بالبلدۃ الحرام

السیّد محمّد الکتبی الخطیب وَالامام بالبلدۃ الحرام

السیّد مُحمّد مکی خلوتی الخطیب وَالمدرس بالمسجد الحرام

مَولانا محمد گل

مولانا نعیم الدین

المفتی احمد یارخاں

↑ عبدالنبی

اس ترتیب میں سلسلۂ شیوخ اوپر کی طرف گیا ہے یعنی اوپر کا شخص نیچے درج ہونے والے کا شیخ واستاذ ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳) مولانا حافظ سند علی بن محمد علی سکنہ محلہ رکھا ریاں ۔ گجرات) اور پیرزادہ محمد مسعود الحسن ابن پیر محمد سعید قدس سرہٗ حجرہ شریف نے بھی سند دورۂ حدیث حاصل کی ۔ اول الذکر حافظ صاحب جامع عیدگاہ گجرات میں خطیب اور مسجد میاں جلال محلہ خواجگان میں اپنے قائم کردہ دینی مدرسے کے مہتمم ہیں اور موخر الذکر صاحبزادہ مسعود صاحب کھوڑ ہائی سکول (کیمبل پور) میں جے وی و دینیات کے استاذ ہیں ۔

عملی زندگی

مختلف ادوار کا تعارف
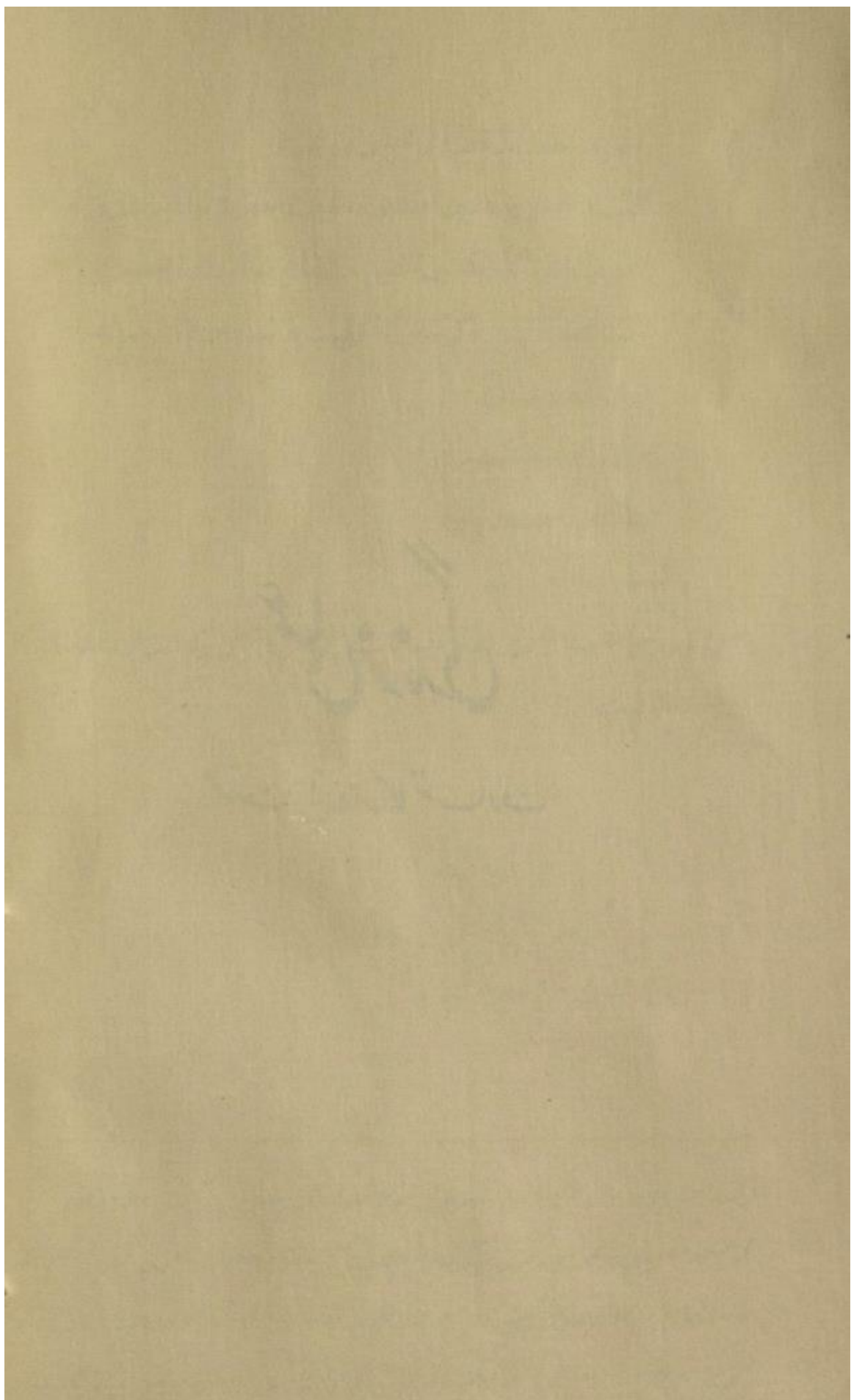
عملی زندگی

مفتی صاحب قدس سرہٗ کی سیرت میں عملی سے مراد' تدریس' فتویٰ' خطبہ' و موعظت اور تصنیف و تالیف کی زندگی ہے۔ انہوں نے طالب علمی کا دَور بھی محنت اور جانفشانی سے گذارا تھا۔ اور عملی زندگی میں بھی وہ مسلسل جدوجہد اور ذوقِ عمل کی تصویر بنے رہے۔ غالباً جب وہ ریاست بینڈھو میں پڑھتے تھے تو کھانا تقسیم ہونے کے موقع پر وہ طلبہ کی قطار میں سب سے پیچھے رہ جاتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہمیشہ عمدہ کھانا اور سالن اُن سے پہلے ہی ختم ہو جاتا اور اکثر اوقات انہیں روکھی روٹی حصے میں آتی۔ یہ منظر دیکھ کر معمّر باورچی کہا کرتا: "احمد یار' کھانے پر جھپٹنے والے اکثریوں ہی رہ جائیں گے علم کے آفتاب تم ہی بن کر چمکو گے"۔ کسی دوسرے مدرسے یا اسی مدرسے کی بات ہے کہ رات مطالعے کے لئے جو تیل ملتا تھا وہ تقریباً نصف شب تک چلتا تھا مگر مفتی صاحب کا کاروانِ شوق ہمیشہ نصف شب سے آگے بڑھ جایا کرتا تھا اس لئے مدرسے کا چراغ گُل ہونے کے بعد وہ مدرسے سے باہر نکل آتے اور گلی کی بتی میں بیٹھ کر مطالعہ کرنے لگ جاتے۔ ایسا ہی ذوقِ محنت اور جذبۂ عمل تدریس اور تصنیف کی زندگی میں بھی ان کے ساتھ ہمرکاب رہا۔ انہوں نے آرام اور راحت کے زمانے میں بھی طلبہ کی تدریس کا کام محنت اور فکرمندی کے ساتھ کیا اور ان کا قلم ضعف اور بیماری کے ایام میں بھی عرصۂ تصنیف میں مسلسل گرم رفتار رہا۔

⁂

پہلے بیان ہو چکا ہے مفتی صاحب ۱۳۴۴ھ (مطابق ۱۹۲۴/۱۹۲۵ء) میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ آخری ایامِ حیات تک مختلف مقامات پر دینی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کا وصال ۱۳۹۱ھ (۱۹۷۱ء) میں ہوا ہے۔ اس طرح چھیالیس سال یعنی تقریباً نصف صدی تک خدمتِ دین و تہذیب کا یہ چراغ اپنے خونِ جگر سے روشن رہا۔ اس زندگی کا آغاز مراد آباد جامعہ نعیمیہ سے ہوا تھا اور اس کی انتہا گجرات مدرسہ غوثیہ نعیمیہ میں ہوئی۔ درمیان میں یہ دریا دھوراجی (کاٹھیاواڑ) کچھوچھہ شریف اور بھکھی میں بھی بہتا رہا۔

دستارِ فضیلت باندھنے کے ساتھ ہی حضرت صدر الافاضل نے مفتی صاحب کو جامعہ نعیمیہ مراد آباد میں تدریس کے فرائض سونپ دیئے تھے۔ مفتی صاحب نے جلد ہی اپنے کو ایک کامیاب مدرس ثابت کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی جامعہ نعیمیہ میں فتویٰ نویسی کی خدمات بھی مفتی صاحب کے سپرد کر دی گئیں۔ بعض احباب کے خیال کے مطابق تصنیف و تالیف کے کام کی داغ بیل بھی اسی دور میں ڈالی گئی۔ چنانچہ "علم المیراث" کا ابتدائی خاکہ ان احباب کے نزدیک مفتی صاحب نے اسی دور میں مراد آباد میں مرتب کر لیا تھا اور حضرت سے اس سلسلے میں مشورہ اور رہنمائی بھی حاصل کی تھی۔ جہاں تک حضرت سے رہنمائی حاصل کرنے کا تعلق ہے تو مفتی صاحب اپنے ہر کام میں حاصل کرتے رہے اور حضرت ہی کے بنائے ہوئے راستوں پر چلتے رہے یقیناً "علم المیراث" جو مفتی صاحب کی پہلی تالیف تھی کے سلسلے میں حضرت صدر الافاضل سے مشورہ کر لیا ہوگا مگر اس کے پیش لفظ میں یہ تصریح خود مفتی صاحب نے فرمائی ہے کہ یہ رسالہ ۱۳۵۲ھ میں جبکہ وہ مدرسہ مسکینیہ دھوراجی میں مدرس تھے تحریر کیا گیا۔[1]

مفتی صاحب مراد آباد میں تدریس و فتویٰ کی خدمت انجام دے رہے تھے کہ دھوراجی کاٹھیاواڑ کے مدرسہ مسکینیہ کے منتظمین کی طرف سے حضرت صدر الافاضل کی خدمت میں درخواست کی گئی کہ دھوراجی میں ایک ایسا جامع الصفات عالمِ دین روانہ کیا جائے جو تدریس فتویٰ اور خطابت

---

[1] احمد یار خاں: علم المیراث (مطبوعہ نعیمی کتب خانہ گجرات)، ص ۲

تمام خدمات دینی کو بطریق احسن انجام دے سکتا ہو۔ اس درخواست کے جواب میں صدر الافاضل قدس سرہٗ نے مفتی صاحب کو دھوراجی جانے کی ہدایت فرمائی۔ مفتی صاحب اس وقت عمر اور شکل وصورت سے نوخیز دکھائی دیتے تھے۔ جب وہ دھوراجی ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو استقبال کرنے والوں کو حیرت ہوئی کہ صدر الافاضل نے یہ طالب علم سا آدمی ہمارے دارالعلوم کے لئے بھیجا ہے۔ خیر وہ لوگ چپکے ہو رہے، دوسرے روز مفتی صاحب مدرسۂ مسکینیہ کی مسند تدریس پر بیٹھے اور حدیث کا کوئی سبق شروع کرایا جس کے آغاز پر انہوں نے اصول حدیث کے بعض بنیادی مباحث پر فاضلانہ تقریر کی۔ اس مجلس میں مدرسہ کے منتظم اعلیٰ حاجی سیٹھ ولی محمد صاحب اور دیگر اراکین بھی موجود تھے۔ مفتی صاحب کی عمر اور چہرہ دیکھ کر جس قدر یہ لوگ مایوس ہوئے تھے مسند درس پر مفتی صاحب کے دریائے علم کی روانی اور گہرائی کا حال معلوم ہونے پر اسی قدر وہ لوگ مسرور اور مطمئن بھی ہوئے۔ چنانچہ مجوزہ مشاہرے میں پہلے دن کی مذکورہ بالا کیفیت دیکھ کر ہی اضافہ کر دیا گیا اور اب وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ صدر الافاضل نے ہمارے پاس "بحر العلوم" بھیج دیا ہے۔ مفتی صاحب دھوراجی میں مدرسہ مسکینیہ کے صدر مدرس کی حیثیت سے تقریباً ۹ برس تک کام کرتے رہے، اس دوران میں متعدد بار حدیث شریف کا دورہ ختم کیا گیا اور بیسیوں طلبہ فارغ التحصیل ہو کر مدرسہ سے نکلے۔ اس مدرسے میں بنگال کے طالب علموں کی اکثریت ہوتی تھی چنانچہ آج بھی بنگال میں بعض مقامات پر اسی دَور کے مفتی صاحب کے شاگرد علمائے دین موجود ہیں دھوراجی کے دَور میں تقریباً دوسرے تیسرے سال میں مفتی صاحب کی شادی ہوئی جس کے لئے وہ وطن او جھانی گئے۔ خطبۂ نکاح صدر الافاضل قدس سرہٗ نے پڑھا۔ اسی دَور میں مفتی صاحب نے اپنی پہلی تالیف علم المیراث مرتب کی جو ۱۳۵۲ھ میں پہلے گجراتی زبان میں شائع کی گئی اور بعد میں اس کا اردو ایڈیشن چھاپا گیا۔ دھوراجی کے زمانے کے تلامذہ میں مفتی صاحب کے ایک نامور شاگرد جناب مولانا آل حسن سنبھلی اشرفی ہیں۔ انہوں نے

علم المیراث کے آغاز پر ایک مختصر پیش لفظ تحریر کیا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا ریاض الحسن سنبھلی گجرات (پاکستان) کے دور میں مفتی صاحب سے پڑھتے رہے ہیں۔

☆

کچھ عرصہ کے بعد مدرسہ مسکینیہ (دھوراجی) گردش لیل و نہار میں آکر مالی مشکلات کا شکار ہوگیا اور کچھ دیگر پریشانیاں بھی مفتی صاحب کے لئے نمودار ہونے لگی تھیں، بالآخر وہ اپنے وطن اوجہانی واپس چلے گئے اور مرادآباد صدرالافاضل قدس سرہٗ کی خدمت میں اپنے حالات کے بارے میں خط لکھ دیا چنانچہ جلد ہی صدرالافاضل نے انہیں مرادآباد بلالیا اور جامعہ نعیمیہ میں تدریس وغیرہ کی خدمات دوبارہ ان کے سپرد ہوئیں۔ علامہ مفتی محمد حسین صاحب نعیمی (مہتمم جامعہ نعیمیہ لاہور) اسی دور میں بعض اسباق مفتی صاحب قدس سرہٗ سے پڑھتے رہے اور مرحوم حکیم مولانا غلام معین الدین نعیمی بھی اسی دور کے تلامذہ میں شامل تھے یہ دور دھوراجی کے آخری ایام سے مفتی صاحب کے لئے عسرت اور مالی تنگی کا زمانہ تھا۔ ان ایام میں مفتی صاحب کے اہل خانہ اپنی تھوڑی سی آبائی جائداد کے کرائے پر گذر اوقات کرتے رہے جو نو روپیہ ماہوار کے لگ بھگ ہوتا تھا۔ بہر نوع ان کا قافلہ حیات صبر و شکر کے ساتھ منزل کی طرف رواں دواں رہا۔

☆

اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس دفعہ مفتی صاحب قدس سرہٗ مرادآباد میں تقریباً ایک سال رہے۔ انہی ایام میں حضرت اشرفی میاں (المعروف، میاں صاحب) سجادہ نشین کچھوچھہ شریف نے صدرالافاضل سے کوئی قابل مدرس اپنے دارالعلوم کے لئے طلب کیا۔ چنانچہ مفتی صاحب کو کچھوچھہ شریف روانہ کر دیا گیا۔ غالباً مفتی صاحب کچھوچھہ شریف میں تین برس کے لگ بھگ تدریس اور افتاء کی خدمات ادا کرتے رہے۔ حضرت میاں صاحب ان پر بہت شفیق تھے۔ مفتی صاحب نے اولاد نرینہ کے لئے دعا کی درخواست کی تو میاں صاحب نے دعا فرمائی اور

ساتھ ہی بشارت بھی دی کہ انشاء اللہ لڑکا پیدا ہوگا اور اس کا نام "ذوالفقار" رکھنا۔ بعد میں یہ نام "محمد مختار" میں تبدیل فرما دیا۔ اتفاق دیکھئے کہ مفتی صاحب کے گھر میں یہ صاحبزادہ (مفتی مختار صاحب) حضرت میاں صاحب کی وفات کے بعد پیدا ہوا۔ جس کا تاریخی نام "ابوجواد محمد مختار" تھا۔ اس سے ۱۳۵۶ھ کا سال برآمد ہوتا ہے۔ اس تاریخ سے کچھوچھہ شریف میں مفتی صاحب کے قیام کے تعین زمانی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس دور میں درگاہ شریف کے بزرگوں کے کئی صاحبزادگان مفتی صاحب سے پڑھتے رہے جن میں صاحبزادہ مختار اشرفی صاحب[1] (ولد حضرت اشرف میاں قدس سرہٗ) بھی شامل تھے۔ بعض وجوہ کی بنا پر مفتی صاحب قدس سرہٗ اور بزرگانِ خانقاہ کے مابین کچھ بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں یا پیدا کی جانے لگیں تو آپ قبل اس کے کہ کوئی ناپسندیدہ صورتِ حال رونما ہو اوجھانی واپس تشریف لے آئے اور حسبِ دستور حضرت صدر الافاضل کی خدمت میں اطلاع بھجوا دی۔

+

حضرت صدر الافاضل قدس سرہٗ نے لاہور میں علامہ سیّد ابوالبرکات (دامت برکاتہٗ) سے رابطہ قائم کر کے انہیں مطلع کر دیا ہوا تھا کہ مفتی احمد یار خاں صاحب ان دنوں فارغ ہیں پنجاب میں تو علمائے دین کی اکثر و بیشتر ضرورت رہتی تھی۔ سیّد صاحب نے حضرت کی خدمت میں درخواست کی کہ مفتی صاحب کو لاہور روانہ فرما دیا جائے۔ لاہور سے مفتی صاحب کو بھکھی ضلع گجرات میں مولانا سیّد جلال الدین شاہ صاحب کے دارالعلوم میں بھجوا یا گیا۔ مگر مفتی صاحب کو یہاں کوئی دلبستگی پیدا نہ ہو سکی۔ دل برداشتہ ہو کر لاہور پہنچے اور ارادہ کر رہے تھے کہ وطن واپس چلے جائیں۔ یہ وہ دور تھا جب کہ صاحبزادہ سیّد محمود شاہ صاحب (ابن پیر سیّد ولایت شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ) حزب الاحناف لاہور میں زیرِ تعلیم تھے۔ انہیں علم تھا کہ گجرات انجمن خدام الصوفیہ کے دارالعلوم کے لئے کسی جیّد عالمِ دین کی ضرورت ہے۔ چنانچہ صاحبزادہ صاحب موصوف نے سید صاحب کی

---

[1] صاحبزادہ صاحب موصوف کئی بار گجرات میں مفتی صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لاتے رہے ہیں۔

وساطت سے مفتی صاحب کی خدمت میں درخواست کی کہ آپ وطن واپس نہ جائیں اور میرے ساتھ گجرات تشریف لے چلیں۔ اہل گجرات کی خوش بختی کہ مفتی صاحب رضامند ہو گئے۔ مفتی صاحب گجرات تشریف لائے اور پھر وہ گجرات کے اور گجرات ان کا ہو کر رہ گیا۔

٭

گجرات میں مفتی صاحب قدس سرہٗ کوئی بارہ تیرہ برس کے قریب دارالعلوم خدام الصوفیہ میں مدرس رہے اور اس کے بعد انجمن خدام الرسول کے ساتھ متعلق ہو گئے۔ یہ دَور تقریباً دس برس کا تھا۔ اس کے بعد گذشتہ چھ برس سے اپنے مکان پر دارالعلوم اور دارالافتاء کی خدمات ادا کر رہے تھے۔ مفتی صاحب کی تمام تالیفات (ماسوائے علم المیراث کے) گجرات ہی کے دَور میں معرضِ وجود میں آئیں اور یہی مفتی صاحب قدس سرہٗ کی زندگی کا اہم ترین دَور متصور ہوتا ہے۔ اس دور کے احوال و آثار کے لئے مفصل بحث اور طویل صفحات کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہم اس دَور پر تفصیلی گفتگو انشاءاللہ آئندہ ایڈیشن میں کریں گے۔

گھر کی زندگی

اندرونِ خانہ کی زندگی میں بھی، مفتی صاحب کے ہاں بڑی باقاعدگی، اور امن و سکون کا راحت بخش ماحول پایا جاتا تھا ان کی ازواج و اولاد کو بھی ایسا علمی و دینی مزاج بخشا گیا کہ مفتی صاحب کی ازدواجی زندگی ان کے لئے هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ (الفرقان: ۷۴) {پروردگار! ہمیں ایسے بیوی بچے عطا کرنا جو ہمارے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک ہوں}" کی عمدہ تفسیر ثابت ہوئی۔

مفتی صاحب کا پہلا نکاح، شیخوپور ضلع بدایون کے ایک معزز افغان خاندان میں، خاندان عبداللطیف خاں کی صاحبزادی سے ہوا۔ ان دنوں، مفتی صاحب دھوراجی (کاٹھیاواڑ) میں مدرس تھے۔ نکاح کی تقریب، اوجھانی میں منعقد ہوئی، جس میں حضرت صدرالافاضل قدس سرہٗ بھی شریک ہوئے، اور آپ ہی نے خطبۂ نکاح پڑھا۔ مفتی صاحب کی یہ اہلیہ گجرات (پاکستان) کے دور تک زندہ رہیں۔ مفتی صاحب کی ساری اولاد ان ہی کے بطن سے ہے۔ ۲۳[1] مئی ۱۹۴۹ء کو ان کا انتقال ہوا اور وہ گجرات میں مدفون ہوئیں۔

---

[1] اسی تاریخ پر گجرات کے مسلم بازار چوک غلہ منڈی کے حصے میں آتشزدگی کا حادثہ پیش آیا، جس میں بیس سے کچھ زائد دکانیں، چند لمحوں میں جل کر راکھ ہو گئیں۔ ان میں سے اکثر دکانیں آتشبازی کے سامان سے بھرپور تھیں۔ میرے بڑے بھائی قاضی عبدالقیوم مرحوم و مغفور، جو محافلِ میلاد میں نعت خوانی کیا کرتے تھے،

(باقی اگلے صفحہ پر)

راقم السطور نے مرحومہ سے قرآن پاک پڑھا، پانچ چھ برس کی عمر میں، میرے والد مرحوم نے مجھے مفتی صاحب کے سپرد کر دیا تھا اور میری تعلیم کا آغاز، مفتی صاحب کے گھر میں ہوا، جہاں میری معلّمہ، مفتی صاحب کی اہلیہ مرحومہ ہی تھیں۔ مرحومہ، نہایت اعلیٰ اوصاف کی حامل، بڑی نیک دل اور پارسا خاتون تھیں۔ وُہ اپنے زیرِ تعلیم شاگرد بچوں اور بچیوں کو بھی اپنے پیٹ کی اولاد کی طرح عزیز رکھتی تھیں اور ہم لوگ انہیں امی جان کہہ کر ہی پکارا کرتے تھے۔ میرے بچپن کا اکثر حصّہ، ان کے سایۂ عاطفت میں گزرا، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ تعلیم کے علاوہ، میری تربیت میں بھی، ان کی توجہات کا بڑا دخل ہے۔ ان کی شفقتوں اور مہربانیوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مرحومہ، ایک کھاتے پیتے گھرانے سے آئی تھیں اور مفتی صاحب کے ساتھ انہوں نے وطن سے ہزاروں میل دور، ایک لمبی رفاقت کے جملہ نشیب و فراز، کمالِ استقامت کے ساتھ گزارے تھے۔ جس میں فراخی کے دن بھی دیکھے، مگر عُسرت اور شدّت کے دنوں میں بھی انہوں نے صبر و شکر کی خاموش اور باوقار زندگی گزاری۔ مشکلات و شدائد یا گردشِ ایّام کا کبھی کوئی شکوہ، ان کی زبان سے کسی نے نہ سنا۔ انہیں اپنے شوہر کے منصبِ دینی اور اس کے تقاضوں کا کامل احساس تھا، اس لئے امورِ خانہ داری سے لے کر بچّوں کی تربیت تک، اپنے تمام فرائض وہ اسی احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ادا کرتی تھیں، اور مصروفیات کے بارِ عظیم کے باوجود، وُہ گھر کے ماحول کو ایسا باسلیقہ

(بقیہ حاشیہ صـ ۴۳)

کی جنرل مرچنٹس کی دکان بھی اسی بازار میں جل گئی، اور بھائی جان بھی اس سانحے میں فوت ہو گئے۔ ادھر ہم لوگ امی جان مرحومہ (مفتی صاحب کی اہلیہ) کی تجہیز و تکفین سے بمشکل فارغ ہوئے ہوں گے، کہ آتشزدگی کے اس سانحے اور اس میں بھائی کی موت کی خبر آ پہنچی اور جب ہم گھر پہنچے تو اُن کی لاش صحن میں پڑی تھی رحمہُ اللہ تعالیٰ۔

رکھتی تھیں کہ مفتی صاحب کے لئے گھر کا کوئی مسئلہ ، باعثِ ناخوشگواری نہ بننے دیتیں ۔ ناگواری یا رنج کی کوئی لہر اُبھرتی بھی ، تو وہ اس عظیم خاتون کے تحمل اور بردباری میں جذب ہو کر رہ جاتی ۔ آخری ایّام میں ان کی صحت نہایت کمزور رہنے لگی تھی ، اس کے باوجود گھر کے فرائض ، نماز ، روزہ اور بچّوں کی تعلیم ، کسی کام میں فرق نہ پڑنے دیا اور مجھے تو حیرت ہی رہی کہ وہ گھر کی انتہائی بھرپور مصروف زندگی میں سے ، عبادت کے لئے اور بچّوں کو پڑھانے کے لئے کس طرح وقت نکال لیتی تھیں ۔ صرف گجرات کے زمانے میں ، سینکڑوں خواتین ، بچّوں اور بچیوں نے ان سے پُورا قرآن پاک پڑھا تھا ۔ مفتی صاحب کو مرحومہ کے انتقال پر گہرا صدمہ ہوا ، کہ یہ ایک ایسے ساتھی کا فراق تھا ، جس نے دنیا کے امور کے بعد ، دینی فرائض کی ادائیگی میں بھی ، ان کے دوش بدوش محنت اور جانفشانی سے کام کیا تھا ۔

ایک عرصہ گزر جانے کے بعد ، احباب کے مشورے اور اصرار پر مفتی صاحب نے دوسرا نکاح کرنا منظور فرما لیا ۔ یہ نکاح گجرات میں ہوا ۔ اس نیک خاتون نے بھی مفتی صاحب کی خدمت ، اور فرائض خانہ کی ادائیگی عمدہ طریق سے انجام دی ۔ ان کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی مگر انہوں نے مفتی صاحب کی پہلی اولاد ہی کو اپنے پیٹ کی اولاد تصوّر کیا ۔

مفتی صاحب قدس سرہٗ کے ہاں دو صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں پیدا ہوئیں جن میں دو منجھلی صاحبزادیاں فوت ہو گئی تھیں ۔ صاحبزادگان کی تمام تر تعلیم ، اپنے والد ماجد کے پاس ہی ہوئی ۔ ماسوا بعض اسباق کے ، کہ وُہ انہوں نے میرے بزرگ ہم سبق حافظ سید علی صاحب سے پڑھے ۔ وقتاً فوقتاً جزوی طور پر راقم الحروف سے بھی پڑھا اور یہ اس لئے ہوا کہ مفتی صاحب ، بعض چھوٹے اسباق ہمارے سپرد کر کے ہمیں تدریس کا تجربہ کراتے تھے ۔

ہر دو صاحبزادگان نے دورۂ حدیث، مفتی صاحب قدس سرہٗ کے پاس ختم کیا، اور سندِ فراغت حاصل کی۔

بڑے صاحبزادے مولانا مفتی مختار احمد خاں نے بعد میں "فاضل فارسی" و "فاضل عربی" کے امتحانات بھی کئے۔ فراغتِ علمی کے بعد انہوں نے تبلیغ وخطابت اور تدریس کے فرائض انجام دینے شروع کئے۔ گجرات کی مختلف جامع مساجد میں ان کی خطابت کا دور، تقریباً چار سال پر مشتمل ہے۔ کمپنی باغ سرگودھا اور حافظ آباد میں بھی انہوں نے تھوڑے عرصے کے لئے خطابت کی۔ اب پچھلے بارہ برس سے، وہ سیالکوٹ جامع مسجد چوک علامہ اقبال میں خطبۂ جمعہ دے رہے ہیں۔ سیالکوٹ میں جمعہ کا مرکزی اجتماع، اسی مسجد میں ہوتا ہے اور مفتی مختار صاحب سیالکوٹ کے مقبول ترین خطیب شمار ہوتے ہیں۔ خطابت کے ساتھ انہوں نے چھ سال تک تدریس کی خدمات بھی انجام دیں اور کافی عرصہ تک، تفسیر نعیمی اور مرأت شرح مشکوٰۃ کی املا بھی، مفتی صاحب قدس سرہٗ سے لیتے رہے۔ ان کی بڑی خوش بختی یہ ہے، کہ اُن کے عظیم والد اُن سے خوش اور راضی تھے۔ اس نعمت میں ان کے چھوٹے بھائی مفتی اقتدار احمد خاں بھی شریک ہیں۔ اللہ کا شکر ہے، کہ مفتی صاحب کے بعد، ہر دو صاحبزادگان، ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور انہیں اس مشن کی عظمت و اہمیت کا احساس ہے، جو مفتی صاحب نے اپنی زندگی میں جاری کر رکھا تھا۔

خلفِ اصغر مفتی اقتدار احمد خاں نے تعلیم سے فراغت پر، تدریس اور خطابت کی خدمات سنبھال لیں۔ وہ پچھلے سات برس سے، جامع مسجد گلزار مدینہ میں، خطبۂ جمعہ دے رہے ہیں اور تقریباً اتنے ہی عرصے سے تدریس کا کام بھی کر رہے ہیں۔ وہ مفتی صاحب قدس سرہٗ کی تالیفات کی کتابت وطباعت کے کام کی نگرانی بھی کرتے رہے ہیں، کتب خانے کے شعبے کا تمام کام انہی کے سپرد ہوتا تھا۔ والد ماجد کے پاس رہنے کے باعث انہیں بھی خدمت کرنے کے خوب مواقع میسر آتے رہے ہیں اور اس سے بڑی نعمت

وہ دولت اُن کے لئے اور کیا ہوسکتی تھی۔ ہماری دعا ہے کہ ہر دو صاحبزادگان کو، اس امانت عظیمہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق ارزانی ہو، جو ان کے عظیم والد، اُن کے سپرد کر گئے ہیں۔

مفتی صاحب مرحوم و مغفور میں، ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے فریضے کی طرف سے کبھی غفلت نہ برتی، جبکہ علماء اور پیران کرام کے ہاں، بالعموم ان فرائض کی طرف کم ہی توجہ کی جاتی ہے۔ مفتی صاحب اپنی بچیوں کی تعلیم کا اہتمام بھی فرماتے تھے۔ سب سے بڑی صاحبزادی (جنھیں ہم لوگ آپا جان کہا کرتے) کو قرآن پاک، اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم، امی جان نے دی اور نوشت و خواند کی تعلیم سب بچیوں کو دی گئی۔ ایک دو بچیوں کو کچھ عرصے کے لئے سکول میں بھی داخل کرایا گیا تھا۔ زندگی کے آخری سالوں میں مفتی صاحب کو یہ احساس زیادہ ستانے لگا تھا کہ خواتین میں' علم دین کا بہت فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے خواتین کو دینی تعلیم دینے والی ایک ٹیم خود اپنے گھر میں پیدا کر دی۔ انہوں نے اپنی بڑی بہو اور چھوٹی صاحبزادی کو مشکوٰۃ و بخاری کا ترجمہ چار سال میں پڑھایا۔ صرف و نحو کے ضروری قواعد اور عربی بول چال کی کچھ مشق بھی کراتے رہے۔ نیز ان بیٹیوں کو وعظ کہنے کا طریقہ بھی سکھایا۔ ان بیٹیوں نے آگے، دیگر خواتین اور طالبات کی کلاسیں لگا کر انہیں پڑھانا شروع کر دیا۔ یہ طریقہ اس قدر فیض رساں ثابت ہوا، کہ اب تک تقریباً چار سو بچیاں اور خواتین، مفتی صاحب کے گھر سے' دینیات' کی اس کلاس میں پڑھ کر فارغ ہو چکی ہیں۔
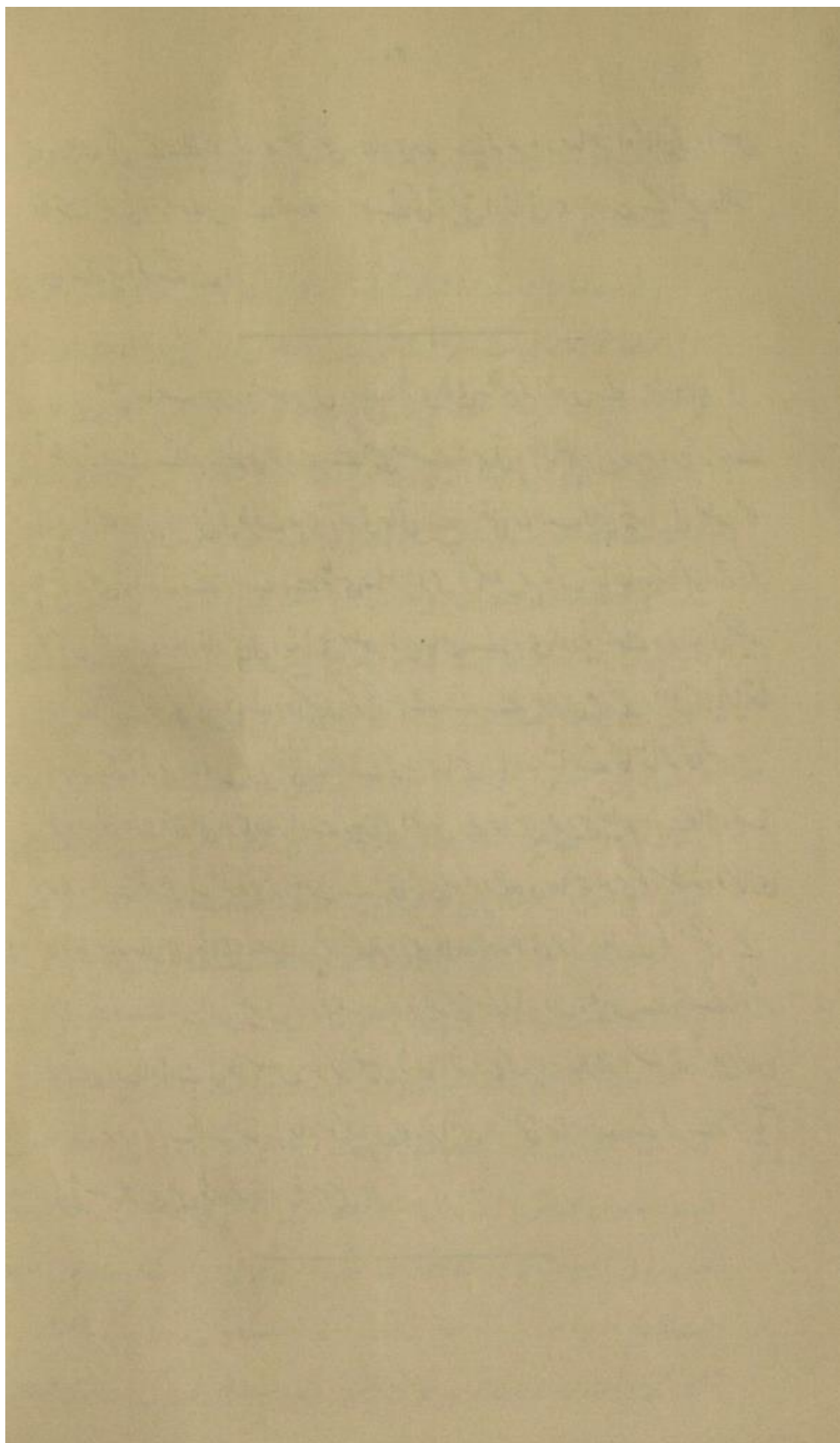
تصنیفی کام

پر

ایک ابتدائی نظر

تصنیفی کام پر ایک نظر

تفسیر نعیمی

تفسیر نعیمی کی سات جلدیں (پہلے سات پاروں پر مشتمل) طبع ہو چکی ہیں۔ آٹھویں پریس میں ہے۔ نویں اور دسویں کا مسودہ مکمل ہو چکا ہے، اور گیارھویں کی تالیف جاری تھی اس میں آیت: اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۝ (یونس: ۶۲) کی تفسیر مکمل لکھ چکے تھے، کہ حضرتِ مولف کا انتقال ہو گیا۔

اس تفسیر کی تالیف کا آغاز ۱۰۔ ربیع الآخر ۱۳۶۲ھ[1] دوشنبہ کے دن سے

---

[1] اس دور میں، استاذِ گرامی، انجمن خدام الصوفیہ کے مدرسے میں صدر مدرس تھے۔ جب تفسیر نعیمی کے کچھ اجزاء مکمل ہوئے تو پنجاب میں کاغذ دستیاب نہ تھا۔ چنانچہ انجمن مذکور کے ارکان، حیدرآباد دکن سے ایک آدھ پارہ چھپوا کر لائے۔ ظاہر ہے کہ جلد اول کا دیباچہ اور مقدمہ وغیرہ اسی دور میں لکھے گئے۔ اور ان کے آخر میں تاریخیں بھی اسی دور کی ہیں یعنی ۱۳۶۱ھ۔ مگر تازہ ایڈیشن میں ناشرین نے ایک بات کا خیال نہیں رکھا کہ مقدمے کے آخر میں، اور جلد اول کے خاتمے پر، اسی پرانی تاریخ کے ساتھ، مولف کے نام کے ساتھ، "مہتمم مدرسہ غوثیہ نعیمیہ گجرات" کے الفاظ لکھے ہیں، جن سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، کہ مفتی صاحب، ۱۳۶۲ھ ہی میں، مدرسہ خدام الصوفیہ کے بجائے، "مدرسہ غوثیہ نعیمیہ" میں منتقل ہو چکے تھے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ سال، مدرسہ خدام الصوفیہ کے دور کے ابتدائی سالوں میں تھا۔

کیا گیا۔ دیباچے میں، مولف نے شکایت کی ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں اکثر و بیشتر اردو تفسیریں، عقائدِ باطلہ رکھنے والے فرقوں کی طرف سے لکھی گئی ہیں، اور ان تفسیروں سے معتقداتِ فاسدہ کی اشاعت اور صحیح اسلامی افکار سے بُعد پیدا کرنے کا کام لیا گیا ہے بنا بریں، مولف ایک عرصے سے، تمنّا رکھتا تھا کہ اُردو زبان میں ایسی تفسیر تالیف کی جائے جو مذکورہ اعتزالی عقیدوں، اور گمراہ کن نظریوں سے عامۃ الناس کو محفوظ کر دے مگر یہ ارادہ پُورا نہ ہوتا تھا، تا آنکہ حضرت مولف گجرات میں تشریف لے آئے، اور اس دیرینہ تمنّا کے برآنے کی صورت پیدا ہُوئی۔ مولفِ علام کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"عوام چاہتے ہیں کہ اس کے مضامین ہماری زبان میں ہم تک پہنچیں، اس لئے تقریباً میں اس کی بے شمار تفسیریں لکھی گئیں۔ زبان اردو بھی کسی سے پیچھے نہ رہی مگر اہل ہند[1] نے مسلمانوں کے اس جذبے سے غلط فائدہ اٹھایا کہ اپنے خیالات فاسدہ کو تفسیری رنگ میں ظاہر کیا۔ مرزائی، نبوتِ مرزا کا مقصد لے کر مفسر بنے۔ چکڑالوی اپنے مذہب نامہذب کی اشاعت، تفسیر کی آڑ میں کرنے لگے۔ بعض نے ولایتی عینک سے قرآن پاک کو دیکھا۔ بعض لوگوں نے شیطانی دل و دماغ سے اسے سمجھا، کہ خود قرآن کریم سے صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین نکالنے لگے۔ شیطانی توحید کو ایمانی توحید بنا کر خلق کے سامنے پیش کرنے لگے۔ آج کل ہر مذہب نے ترجمۂ قرآن کو اپنے لئے آڑ بنایا ہے۔ جگہ جگہ مسجدوں میں قرآنی ترجمے درس کے بہانے مسلمانوں کو بہکایا جا رہا ہے۔ جاہل اُردو خوان ...... مفسر بنا ہوا ہے۔ اس لئے عرصہ سے میرا ارادہ تھا کہ کوئی ایسی تفسیر لکھوں، جو کہ عربی معتمد تفاسیر کا خلاصہ ہو اور جس میں موجودہ فرقوں کے

---

[1] یہ عبارت قبلِ تقسیم لکھی گئی تھی۔ مراد برعظیم پاک و ہند ہے۔

نئے نئے اعتراضات کے جوابات دیئے جائیں، کیونکہ اردو تفاسیر عام طور سے بد مذہبوں کی ہیں کہ رب تعالیٰ نے مجھے شہر گجرات علاقہ پنجاب میں بھیجا۔ یہاں، مجھے روزانہ تفسیرِ قرآن سنانے کی خدمت میسّر ہوئی۔ اس وقت یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ تفسیر کبھی کتابی شکل میں چھپے گی۔ ہوا یہ کہ بعض احباب نے روزانہ تقریریں لکھنا شروع کر دیں۔ جب چند پارے ختم ہوئے تو عام مسلمانوں کا خیال ہوا کہ اس کو چھپوا دیا جائے۔ یہ تو ممکن نہ تھا کہ وہی تفاسیر بجنسہٖ چھپائی جائیں۔ بلکہ ان پر نظرثانی کر کے، انہیں زوائد ومکررات سے خالی کرنا، نئے فوائد بڑھانا ضروری تھے۔ کیونکہ تحریر وتقریر میں فرق ہوتا ہے۔........ حق تعالیٰ کے بھروسے پر یہ کام شروع کر دیا۔ رب تعالیٰ میری زبان وقلم وکلام کو غلطی سے بچائے، حق باتیں ظاہر فرمائے، اور بخیر وخوبی اس کام کو انجام پر پہنچائے، اور اسے قبول فرمائے، اور مجھ فقیر بے نوا کے لئے صدقۂ جاریہ اور توشۂ آخرت بنائے[1]......."

گجرات میں، حضرت مولّف کا شہرۂ آفاق درس، مسجد میاں جلال محلہ خواجگان میں سالہا سال تک جاری رہا۔ اُنیس برس گزرے تو درسِ قرآن کا سلسلہ ایک بار تکمیل پذیر ہوگیا، اور پھر دوبارہ پہلے پارے سے شروع کر دیا گیا۔ دوبارہ درس کے سلسلے میں جو مزید مضامین اور فوائد بیان ہوئے، تفسیر نعیمی کے تازہ ایڈیشنوں میں۔ ان کا اضافہ کر دیا گیا۔ مولّفِ علام نے اس سلسلے میں حسب ذیل مختصر سا پیش لفظ تحریر فرمایا:

" اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اُنیس ۱۹ سال میں پہلی بار درسِ قرآن ختم ہوا۔ پھر دوبارہ شروع کیا گیا۔ دورانِ درس میں، بہت تفسیری نکات، فوائد، نئے اعتراضات وجوابات وغیرہ بیان ہوئے، وہ تمام اس میں، زیادہ

---

[1] مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی دیباچہ جلد اول ص د

کر دیئے گئے۔ اب بفضلہٖ تعالیٰ یہ تفسیر کچھ اور ہی چیز ہو گئی۔ والحمد علیٰ ذٰلک[1]۔

احمد یار خاں............

. . . .

۲۵۔ شوال المکرم ۱۳۷۸ھ

یوم دو شنبہ

تفسیرِ نعیمی کی بُنیاد، زیادہ تر عربی تفاسیر پر قائم ہے اور خود مولّف کے الفاظ ہیں "یہ تفسیر عربی معتمد تفاسیر کا خلاصہ ہے۔" صوفیانہ مطالب کے لئے تفسیر رُوح البیان، اور معقولی مباحث کے لئے تفسیر کبیر رازی سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے۔ فارسی تفاسیر میں، تفسیرِ عزیزی، اور اردو تفاسیر میں، تفسیر خزائن العرفان کو مدّ نظر رکھا گیا ہے موخرالذکر اردو تفسیر، کے بارے میں مولّف، لکھتے ہیں:

"اُردو تفاسیر میں سب سے بہتر تفسیر خزائن العرفان مصنفہ حضرت مرشدی، استاذی صدر الافاضل مولانا الحاج سیّد محمد نعیم الدین مراد آبادی دام ظلّہم ہے۔ اس کو مشعلِ راہ بنایا گیا۔ گویا یہ تفسیر اس کی تفصیل ہے[2]۔"

اُردو تراجم میں، مولّفِ علام نے صرف فاضل بریلوی اعلیٰحضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں قدس سرہٗ کے ترجمے پر اعتماد کیا ہے۔ اور اسی ترجمے کو بنیاد بنا کر یہ تفسیر تحریر کی ہے:

"اردو ترجموں میں نہایت اعلیٰ اور بہتر اعلیٰحضرت قدس سرہٗ کا ترجمہ کنزالایمان ہے، اسی پر یہ تفسیر کی گئی ہے[3]۔"

"تفسیرِ نعیمی" کی چند خصوصیات ایسی ہیں، جو اسے دیگر اردو تفاسیر میں، بلکہ بعض پہلوؤں سے تمام تفسیری لٹریچر میں، ممتاز کر دیتی ہیں۔ مثلاً ہر آیت کی علمی تفسیر و تشریح کے بعد آخر میں ایک عنوان "صوفیانہ تفسیر" کا ملتا ہے۔ صوفیانہ نکات کے لئے اگرچہ "رُوح البیان"

---

[1] مفتی احمد یار خاں، "تفسیرِ نعیمی"، دیباچہ جلد اوّل ص ۹ [2] تفسیرِ نعیمی دیباچہ جلد اوّل [3] الف

کو مرجع و ماخذ بنایا گیا ہے، مگر انصاف یہ ہے کہ فاضل مولف کے منفرد واضح اور سادہ و آسان اندازِ تعبیر نے ان گہرے اسرار کو یوں پیش کیا ہے، کہ اب یہ چیزیں ان کی اپنی طبعزاد معلوم ہوتی ہیں اور یہ کیسا کمال ہے کہ تصوف کے عمیق نکات کو نہایت آسانی کے ساتھ عوام کے اذہان کے قریب پہنچا دیا گیا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ[1]

{ترجمہ: "پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے، تو وہ پتھروں کی مثل ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ کڑے، اور پتھروں میں، تو کچھ وہ ہیں کہ جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں}

کی تفسیر صوفیانہ میں لکھتے ہیں:

"تفسیر صوفیانہ: ہر دل میں، فطری طور سے، خوفِ الٰہی اور شفقتِ خلق کے پانی موجود ہیں، گناہ اور بے دینوں کی صحبت اس کو خشک کرنے والی دھوپ ہے۔ جب انسان گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو رفتہ رفتہ یہ دونوں پانی خشک ہو جاتے ہیں۔ جس سے کہ اس کا دل خشک کنکر یا پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ سختیِ قلب کی تین علامتیں ہیں، آنکھ کا خشک ہونا، یعنی آنسو نہ نکلنا۔ دنیوی اُمیدوں کی زیادتی، اور حرص۔ زیادہ بولنا اور زیادہ ہنسنا قلب کو سخت کر دیتا ہے۔ خوفِ الٰہی میں آنسو اور زیادہ ذکرُاللہ، دل کو نرم کرنے والی چیزیں ہیں ــ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر رحمتِ الٰہی امداد نہ کرے، تو آیتیں اور نشانیاں، دل کی سختی بڑھاتی ہیں۔ جیسے کہ ان یہود نے انبیاء کے معجزے دیکھے، مگر ان میں زیادہ سختی پیدا ہوئی۔ ہدایت، فضلِ رحمان سے ملتی ہے، نہ کہ دلائل و برہان سے۔[2]"

---

[1] البقرہ: ۷۴، [2] مفتی احمد یار خاں: تفسیر نعیمی جلد اول ص ۴۳۰۔

اسی طرح ایک بڑا امتیاز اس تفسیر کا یہ ہے کہ اس میں بیک وقت متعدد فرق باطلہ کے خیالات و نظریات پر تنقید کی گئی ہے اور قرآن پاک کے مختلف مقامات پران کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ خود فاضل موتف دیباچے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"تقریباً ہر آیت کے تحت آریہ، عیسائی .... نیچری، چکڑالوی وغیرہم کے اعتراضات معہ جوابات بیان کئے گئے۔ ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب کے جوابات دیئے گئے لیکن یہ کتاب مجھے بعد میں ملی اس لئے اس کی باقاعدہ تردید کچھ دور جاکر ہوئی۔"[1]

اس کی مثال کے لئے "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کی تفسیر کے ماتحت، تفسیر نعیمی کا ایک مقام یہاں درج کیا جاتا ہے جس میں آریوں کے اس عقیدے کی تردید کی گئی ہے کہ آخرت کے بجائے اس دنیا ہی میں مختلف جونوں کی تبدیلی سے ہی اعمال کی جزا سزا ہوتی رہتی ہے:

"آریوں کے عقیدے میں یہ دُنیا ہی عمل اور جزا کی جگہ ہے۔ وُہ کہتے ہیں کہ جو انسان بُرے کام کرتا ہے وُہ مرنے کے بعد بُری جون میں آتا ہے اور اچھے کام کرنے والا اچھی جون میں۔ جس قدر جانور وغیرہ ہیں یہ پہلے انسان ہی تھے لیکن یہ اپنی بدعملی کی وجہ سے اِن جونوں میں آئے۔ تو ان کے نزدیک دنیا عمل و جزا دونوں کی جگہ ہے لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا فقط عمل کی جگہ ہے یہاں جزا نہیں .... آریوں کا یہ عقیدہ بالکل خلافِ عقل ہے اوّلاً تو اس لئے کہ جب دُوسری جون میں پہنچ کر پہلی جون کا آرام یا تکلیف یاد ہی نہ رہا تو اُس کو اپنے گزشتہ اعمال کا احساس ہی کیا ہوگا۔ اور تکلیف اور غم محسوس ہی کیا ہوگا مثلاً ایک شخص آج فقیرِ بے نوا ہے۔ ان کے قاعدے سے، پہلے کسی اچھے حال میں زندگی گزار گیا تھا لیکن اپنی بدعملی کے

---

[1] مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی جلد اول۔ ص ۶۰۷۔

باعث اب فقیر بنا کے بھیجا گیا جب اسے یاد ہی نہ رہا کہ پہلے میں کیا تھا اور اُس وقت میں نے کیا کیا تھا کس عیش میں تھا یہ کس عمل کی سزا ہے تو اب اس کو اس فقیری میں تکلیف ہی کیا ہو گی۔ وُہ تو اپنی فقیری میں ہی خوش اور مست ہے۔[1]

ہدایت اور گمراہی کے مضامین قرآنِ پاک میں بار بار دہرائے گئے ہیں اور مخالفین کی طرف سے یہاں اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گمراہ ہونے کا اختیار اور موقعہ ہی کیوں دیا۔ گمراہی کا اختیار اور موقعہ دے کر گویا انسان کو فساد اور شر کی طرف دھکیل دیا گیا ہے۔ اس اعتراض اور اس کے جواب کو تفسیر نعیمی کے مخصوص انداز میں ملاحظہ کیا جائے

"اعتراض: اللہ تعالیٰ نے انسان کو گمراہ ہونے کا اختیار بھی کیوں دیا، گمراہی کا اختیار دینا بھی بُرا ہے۔

جواب: بندے میں اختیار پیدا کرنا بُرا نہیں بلکہ اس کا غلط استعمال کرنا بُرا ہے، سپاہی کو حکومت ہتھیار دیتی ہے دشمن کو مارنے کے لئے۔۔۔ جو سپاہی اپنے ہی آدمی کو اس ہتھیار سے مارے، سپاہی مجرم ہے نہ کہ حکومت۔ رب نے ہم کو تمام قوتیں، اختیارات، نیکیاں کرنے کے لئے دیئے۔ فرمایا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝[2] ہم اگر ان قوتوں کو حرام میں خرچ کریں تو ہم مجرم ہیں۔[3]"

اس تفسیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے پہلی بار عربی مفسرین کرام کے

---

[1] مفتی احمد یار خاں: تفسیر نعیمی جلد اول ص ۶۴۔

[2] الذاریات: ۵۶ "میں نے جن وانس کو پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔"

[3] مفتی احمد یار خاں: تفسیر نعیمی جلد اول ص ۲۲۷۔

بیان کردہ مطالب و مقاصد کو کھلے انداز اور آسان زبان میں پیش کیا ہے ، جس سے عامۃ المسلمین کے کم پڑھے لکھے طبقوں کے لئے بھی قرآن فہمی کے دروازے کھل گئے ہیں ۔ خود مؤلفِ علام دیباچے میں رقمطراز ہیں :

" بہت کوشش کی گئی ہے کہ زبان آسان ہو اور مشکل مسائل بھی آسانی سے سمجھا دیئے جائیں ۔"

علاوہ ازیں آیات کا باہمی ربط و تعلق اور اسی طرح آیات کی شانِ نزول کے مباحث کو ایسی تفصیل اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ دوسری کوئی اُردو تفسیر اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی ۔

مؤلف نے عربی فارسی تفاسیر میں درج ہونے والا ایسا بہت سا مواد اس اردو تفسیر میں منتقل کر دیا ہے جو عامۃ الناس کی دلچسپی کا موجب بنتا ہے ۔ ایسا کرنے میں اگرچہ اصل مقصود یہ ہوتا ہے کہ عام قاری کی دلچسپی برقرار رہے اور وہ دلچسپی کے رابطے کے ساتھ اصل مطلوبہ چیزیں بھی ذہن نشین کرتا چلا جائے ۔ مگر اس عمل کے ساتھ ہماری تفاسیر میں ایک کمزوری یہ در آئی ہے کہ بعض بے تحقیق روایات بھی ان میں نقل ہو گئی ہیں ۔ جیساکہ عربی کے تفسیری لٹریچر میں اسرائیلی روایات کا پایا جانا ۔ یا ایسی باتوں کا تفسیری لٹریچر میں شامل ہو جانا ، جن کا سمجھنا عام اہلِ عقل کے لئے بالعموم اور آجکل کے جدید اذہان کے لئے بالخصوص سخت مشکل ہو جاتا ہے ۔ تفسیر نعیمی میں بھی بعض مقامات پر مذکورہ نوعیت کا مواد ، کتبِ تفسیر سے نقل کر دیا گیا ہے ۔

تصنیفات

- **تفسیر نعیمی** ——— "اشرف التفاسیر" تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۶۳ھ کا سال برآمد ہوتا ہے۔ مفتی صاحب اس تفسیر کو گیارہویں پارے کے آخری ربع تک مکمل کر چکے تھے
- **علم المیراث** ——— قانونِ وراثت پر عمدہ نصابی کتاب پہلے گجراتی زبان میں اور بعد میں اردو میں شائع ہوئی۔
- **جاء الحق وزھق الباطل** ——— مسائل اختلافیہ کے بارے میں مدلل کتاب۔ اس کا دوسرا نام "فیصلہ مسائل" بھی ہے۔ یہ کتاب ایک لاکھ سے زائد چھپ چکی ہے۔ امیر ملت پیر صاحب علی پوری نے اس کتاب کو بہت پسند فرمایا۔ "جاء الحق" انہوں نے نام رکھا۔
- **شانِ حبیب الرحمٰن** ——— وہ آیات قرآنی جمع کر دی گئی ہیں جن میں بالصراحت حضور پُرنور کی نعت کا مضمون پایا جاتا ہے۔ ہر آیت پر ایک جامع تقریر کر دی گئی ہے۔
- **اسلامی زندگی** ——— اس میں غیر اسلامی رسوم سے بچنے کی تلقین، اور تقریبات پر اسلامی آداب اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

- **سلطنتِ مصطفےٰ** ——— نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کمالات کی تشریح و توصیف کی گئی ہے۔
- **دیوان سالک** ——— مفتی صاحب قدس سرہٗ کا نعتیہ کلام
- **علم القرآن** ——— قرآن حکیم کی بنیادی اصلاحات کی شرح، اور زمانۂ حال کے بعض جاہل ترجمہ نگاروں پر تنقید۔
- **اسرار الاحکام** ——— شریعت کے احکام و مسائل کی عقلی حکمتیں۔
- **رسالۂ نور** ——— نورِ مصطفوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بیان میں۔
- **رحمتِ خدا بوسیلۂ اولیاء** ——— مسئلہ استمداد و توسل پر مدلل رسالہ
- **جاء الحق حصۂ دوم** ——— منکرین تقلید ائمہ اور مخالفینِ احناف کے جواب میں مدلل اور عمدہ کتاب۔
- **مرأت اردو شرح مشکوٰۃ** ——— آٹھ یا نو جلدوں میں مکمل —٦ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ بقیہ زیرِ طبع ہیں۔
- **نعیم الباری فی انشراح البخاری** ——— بخاری شریف پر عربی حاشیہ، یہ ابھی طبع نہیں ہوا۔
- **نور العرفان فی حاشیۃ القرآن** / **مع فہرس القرآن** ——— قرآن حکیم پر مختصر اور جامع تفسیری حواشی۔ مکمل نسخہ قرآن اعلیحضرت کے ترجمہ کے ساتھ چھپ چکا ہے۔
- **مواعظ نعیمیہ** ——— مفتی صاحب کے مواعظ اور تقاریر کو کتابی شکل میں جمع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تین حصوں میں مکمل ہے۔
- **نئی تقریریں** ——— اوپر والے مجموعے کے بعد تازہ تقاریر کا مجموعہ

- سفرنامہ ایران، عراق حجاز وشام وغیرہ } جب خشکی کے راستے پر حج کے لئے تشریف لے گئے، اس موقع پر لکھا گیا۔
- سفرنامۂ حجاز ــــــــــ سفر حجاز کی علیحدہ یادداشت
- سفرنامۂ حجاز (۲) ــــــــــ یہ ابھی زیرِ طبع ہے۔ آخری حج کی ڈائری ہے
- حضرت امیر معاویہ پر ایک نظر
- الکلام المقبول فی طہارۃ نسب الرسول
- فتاویٰ نعیمیہ
- اکثر نصابی کتب پر مفتی صاحب کے حواشی غیر مطبوعہ پڑے ہیں۔
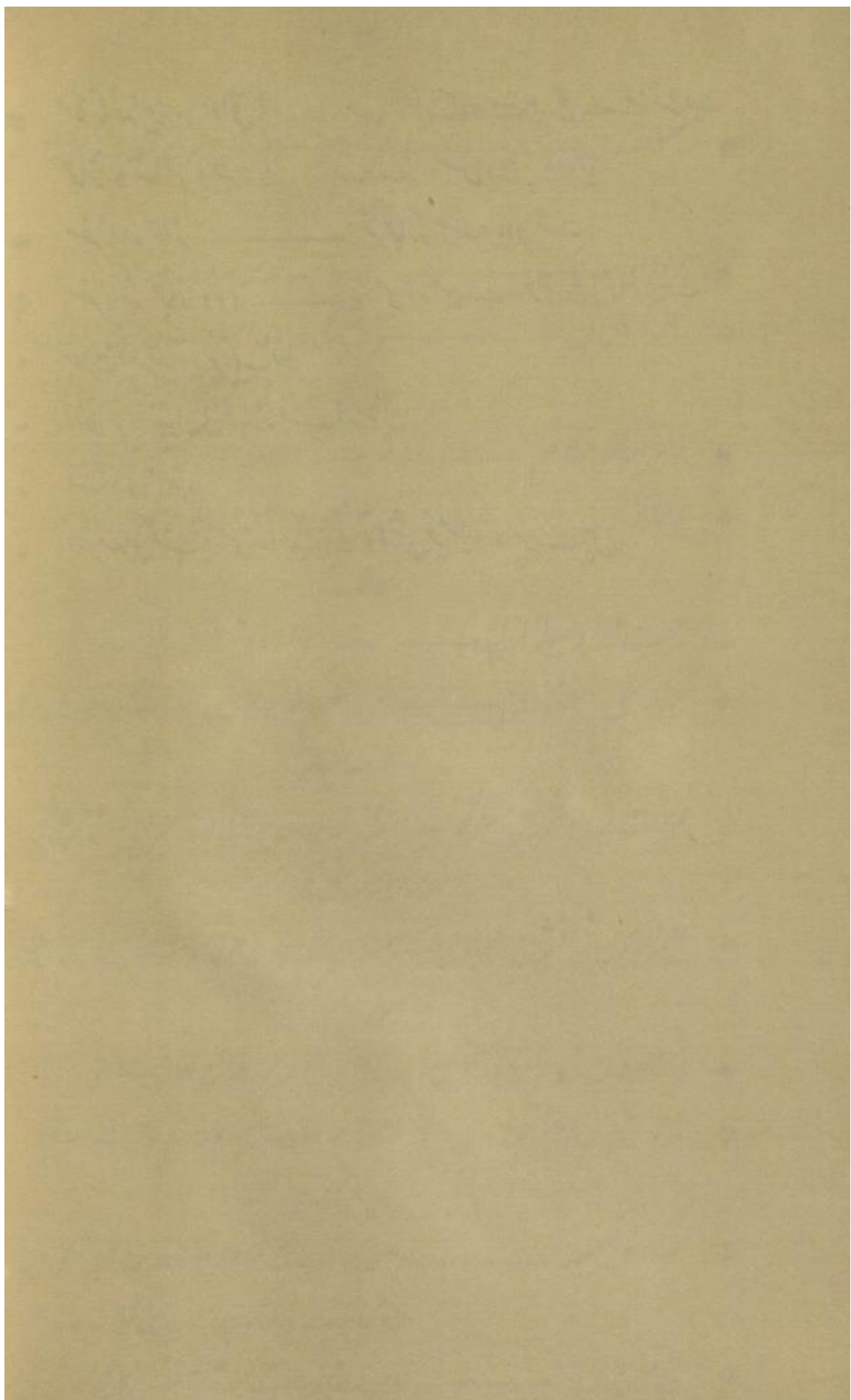
امام اہلِ سُنّت فاضل بریلوی کے بعد اہلِ سُنّت کا ایک عظیم مُصنّف

یوں تو مفتی صاحب مرحوم و مغفور کے وصال سے تبلیغ، تدریس، فتویٰ، وعظ و خطابت اور تصنیف و تالیف کے تمام شعبوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ تقریباً گزشتہ پچاس برس سے وُہ اپنے خاموش تعمیری انداز سے ان تمام شعبوں میں وقیع خدمات انجام دے رہے تھے، مگر ان کی خدمات کا ممتاز ترین پہلو شعبہ تصنیف و تالیف سے متعلق تھا انہوں نے اپنی گراں قدر تصانیف سے اہلسنت کے دینی لٹریچر کی کمی کو کافی حد تک پورا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اگر یہ کہا جائے کہ پاک و ہند کے اہلسنت میں اعلیٰحضرت فاضل بریلوی کے بعد مفتی صاحب ایک عظیم ترین مصنّف تھے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

ہمارے مسلک اور معتقدات سے وابستہ لوگ اس امت کا سواد اعظم ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کروڑوں عامۃ المسلمین کی اعتقادی و عملی تربیّت کے لئے دینی لٹریچر کا بکثرت موجود ہونا نہایت ضروری ہے مگر ہماری محرومی یہ رہی کہ اس متاخر دور میں اہلسنت کے حلقوں نے بہت کم دینی لٹریچر مہیا کیا جس سے عامۃ الناس کی دینی و روحانی تربیّت کا کام خاصا متاثر ہوا۔ دیکھا جائے تو یہ ایک بہت بڑا باعث تھا، اعتزالی فرقوں اور بد مذہبوں کے خیالات کے فروغ پانے کا اس صورت حال نے اعلیٰحضرت کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کیا اور ان کے عظیم قلم نے بیشمار موضوعات پر رسائل و کتب کا ایک گراں بہا ذخیرہ تیار کر دیا۔ مگر اعلیٰحضرت کا پیدا کردہ دینی لٹریچر عالمانہ اور محققانہ انداز کا تھا انہوں نے سوچ سمجھ کر اہل علم کو اپنا مخاطب بنایا تھا تاکہ علماء فضلاء کے ذہن کو متاثر کر کے ان کے ذریعے سے ذہنی و فکری انقلاب کی بنیاد رکھی جائے۔ چنانچہ اعلیٰحضرت کی ہر چھوٹی بڑی تالیف میں یہی اونچا تعلیمی معیار قائم نظر آئے گا۔ علماء اور اہل فکر و دانش طبقے کی بیداری کے لئے ضروری اور بنیادی دینی لٹریچر اعلیٰحضرت کے قلم سے نکل چکا تھا اس کے بعد لٹریچر کے سلسلے میں عامۃ الناس کو براہِ راست مخاطب بنانے والی اور متاثر کرنے والی کتابوں

کی ضرورت شدید طور پر محسوس ہوتی تھی۔ اس شعبے میں مفتی صاحب مرحوم ومغفور کے عظیم قلم نے نمایاں خدمات انجام دیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ذہن خاص طور پر اسی ضرورت کی طرف زیادہ متوجہ تھا کہ عامتہ الناس کے حلقوں کے لئے اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے آسان اور مفید لٹریچر پیدا کرنا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے چنانچہ وہ خود فرمایا کرتے تھے:۔

"میں جب لکھنے کے لئے بیٹھتا ہوں تو یہ بات مدنظر رکھتا ہوں، کہ میں بچوں، عورتوں اور دیہات کے کم پڑھے لکھے لوگوں سے مخاطب ہوں"۔

تفسیر لکھنے کا آغاز کیا تو اس میں بھی ان کا بنیادی احساس یہی تھا کہ ایسی سادہ اور آسان زبان میں قرآن حکیم کی تفسیر لکھی جائے۔ جس سے قرآن حکیم کے مشکل مسائل بھی آسانی سے سمجھ میں آسکیں تفسیر نعیمی کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"بہت کوشش کی گئی ہے کہ زبان آسان ہو اور مشکل مسائل بھی آسانی سے سمجھا دیئے جائیں"۔ [۱]

اور مفتی صاحب کی تصانیف میں آسانی اور سہولت فہم کا یہ جوہر ان کی تفسیر نعیمی ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ان کی تمام تالیفات کا یہی انداز ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مضامین و مطالب کو نہایت واضح اور عام فہم بنا دیتے ہیں، وہ اپنی تحریر اور تقریر دونوں کو عامتہ الناس کے انتہائی قریب لے آئے تھے وہ علمی معیار اور فاضلانہ و محققانہ سطح برقرار رکھنے کی پرواہ نہ کرتے بلکہ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی کہ کم خواندہ سے کم خواندہ آدمی بھی ان کی بات کو سمجھ سکے۔ مضمون کو واضح اور سہل بنانے کے لئے روزمرہ زندگی سے بکثرت مثالیں منتخب کر لیتے، پنجاب میں آنے کے بعد انہوں نے بہت سے پنجابی الفاظ اپنی زبان میں داخل کر لئے تھے اس طرح وہ اپنے لٹریچر میں عامتہ الناس سے اس قدر قریب ہو جاتے ہیں کہ ان کے درمیان اور قارئین کے درمیان کوئی حجاب یا بُعد باقی نہیں رہتا۔ حد یہ ہے کہ مفتی صاحب کے واضح اور آسان اسلوب نے تصوف

---

[۱] مفتی احمد یار خاں : تفسیر نعیمی جلد اول دیباچہ ص ۷

معرفت کے گہرے اسرار و مطالب کو بھی محض خواص کی اجارہ داری سے نکال کر عام آدمی کے لئے بھی قریب الفہم بنا دیا ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ کی جائے:۔

سورۂ بقر کی آیت ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ

(ترجمہ: ۔ پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کڑے اور پتھروں میں کچھ وہ ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں) کی تفسیر صوفیانہ میں لکھتے ہیں: ۔

"تفسیر صوفیانہ: ۔ ہر دل میں فطری طور سے خوف الٰہی اور شفقتِ خلق کے پانی موجود ہیں، گناہ اور بے دینوں کی صحبت اس کو خشک کرنے والی دھوپ ہے، جب انسان گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو رفتہ رفتہ یہ دونوں پانی خشک ہو جاتے ہیں جس سے کہ اس کا دل خشک کنکر یا پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے"[1]۔

عبارت اور اسلوب کے عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب کی تالیفات بلند پایہ علمی مضامین سے بھی معمور ہیں ۔ اس طرح وہ اہلسنت کے ایک ایسے کامیاب مصنف ہیں جس نے علماً اور عامۃ الناس دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید دینی لٹریچر پیدا کیا ۔

اسی طرح مفتی صاحب مرحوم و مغفور کی بصیرت نے اپنے مسلکی لٹریچر کے اس خلا کو بھی محسوس کر لیا تھا کہ ہمارے ہاں تفسیر اور حدیث کے موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے ۔ تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں گزشتہ نصف صدی سے ہمارے ہاں اعلیٰحضرت کے اردو ترجمے اور صدر الافاضل کے تفسیری حواشی (خزائن العرفان) پر ہی قناعت کرنے کو کافی سمجھا گیا ۔ مفتی صاحب اس صورت حال پر

---

[1] مفتی احمد یار خاں : تفسیر نعیمی جلد اوّل ص ۴۳۰

مطمئن نہ تھے ۔ وہ فرمایا کرتے تھے "کاش میں اعلحضرت کے پاس ہوتا تو ان سے عرض کرتا کہ قرآنِ حکیم کی تفسیر آپ کے قلم سے نکلنی چاہیئے"۔ پھر یہ مفتی صاحب ہی تھے، جنہوں نے حضرت صدرالافاضل مرحوم کو بار بار کے اصرار سے "تفسیر خزائن العرفان" لکھنے پر آمادہ کیا۔ مگر صدرالافاضل اپنی گوناگون مصروفیات کے باعث مفصّل تفسیر کا کام نہ کر سکے ۔ تفسیری لٹریچر میں خلا کے اسی احساس نے بالآخر مفتی صاحب کو "تفسیر نعیمی" کے عظیم کام پر لگا دیا ۔ گو یہ کام ان کے ہاتھوں بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا ۔ تاہم وہ پہلے گیارہ پاروں پر اردو زبان میں دس ضخیم مجلّدات تحریر فرما گئے ہیں۔ جن میں سے سات شائع ہو چکی ہیں اور آٹھویں پریس میں ہے ۔ اور ان کی یہ تفسیر نعیمی اس قدر مقبول و متداول ہوئی ہے کہ اس نے کروڑوں کم سواد لوگوں کے لئے فہم قرآنی کے دروازے آسان اور کشادہ کر دیئے ہیں ۔ یوں مفتی صاحب مرحوم نے عوام اہلسنت کا ایک دیرینہ قرض چکانے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔

تفسیر کے ساتھ مفتی صاحب نے اصول تفسیر اور اصول ترجمہ قرآن کی طرف بھی توجہ کی ۔ تفسیر نعیمی کے دیباچے اور مقدمے میں، انہوں نے اصول تفسیر کے علمی مباحث کو اپنے خاص انداز میں، نہایت سہل اور واضح کر کے پیش کیا ہے ۔ بالخصوص، تفسیر تاویل اور تحریف کی جامع تعریفیں اور ان کا باہمی فرق نہایت عمدگی سے بیان ہوا ہے ۔ اسی طرح انہوں نے تفسیر کی شرطیں اور تقاضے بڑی وضاحت اور جامعیت کے ساتھ تحریر کئے ہیں ۔ اس سلسلے میں اپنی تفسیر کے مقدمے میں، وہ نو[۹] شرائط کا ذکر کرتے ہیں جن کو ملحوظ رکھنا کسی مفسّر کے لئے ناگزیر ہو گا[۱] اصولِ ترجمہ کے لئے اور بعض اعتزالی طریقِ کار کے حامل ترجمہ نگاروں کی اغلاط کی نشاندہی کے لئے انہوں نے ایک مستقل کتاب "علم القرآن" تالیف فرمائی ۔ اس کے دیباچے میں ترجمۂ قرآن کے سلسلے میں متدین علماء کی احتیاط اور محنت پر یوں اظہارِ خیال کیا ہے:-

---

[۱] مفتی احمد یار خاں : تفسیر نعیمی مقدمہ صہ ۲۴، ۲۵

"علمائے کرام اور فضلائے عظام' ان کا طریقہ یہ تھا کہ قرآن کریم کے ترجمے کے لئے قریباً اکیس[۲۱] علوم میں محنت کرتے تھے مثلاً صرف' نحو' معانی' بیان' بدیع' ادب' لغت، منطق' فلسفہ' حساب' جیومیٹری' فقہ' تفسیر' حدیث' کلام' جغرافیہ' تواریخ اور تصوف واصول وغیرہ .... پھر بھی اتنی احتیاط سے کہ آیات متشابہات کو ہاتھ نہ لگاتے تھے" [۱]

ساتھ ہی بے احتیاط اور بیباک ترجمہ نگاروں کے فتنے سے یوں خبردار کیا ہے :

"اچانک زمانے کا رنگ بدلا' ہوا کے رُخ میں تبدیلی ہوئی .... لوگوں نے قرآن کو معمولی کتاب' اور قرآن والے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو معمولی بشر سمجھ کر قرآن کے ترجمے بے دھڑک شروع کر دیئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کا انکار بلکہ اس ذات کریم سے برابری کا دعویٰ شروع کر دیا" [۲]

علوم قرآنی اور تفسیر پر لٹریچر کی کمی سے زیادہ بڑھ کر کمی ہمارے ہاں حدیث لٹریچر کی محسوس ہوتی ہے ۔ مفتی صاحب مرحوم کے حساس اور تعمیری دل و دماغ نے اس فقدان کو بھی تشویش سے دیکھا اور آگے بڑھ کر اس خلا کو بھی پورا کرنے کی اپنے طور پر بھرپور کوشش کی ۔ انہوں نے صحیح بخاری کی مکمل شرح عربی میں انشراح بخاری [۳] المعروف بنعیم الباری کے نام سے تالیف کی اور اس کے بعد حدیث کی مقبول عام کتاب مشکوٰۃ المصابیح کا ترجمہ اور مفصل شرح اردو زبان میں تحریر فرمائی ۔ جو آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اس کا نام مرآۃ المناجیح اردو ترجمہ و شرح مشکوٰۃ المصابیح رکھا گیا۔

اس کتاب کے دیباچے میں بھی مفتی صاحب نے قرآن و حدیث کے غلط تراجم پر اظہار افسوس کیا ہے اور ساتھ ہی منکرین حدیث کے ظہور کا بھی تذکرہ کیا ہے انہی گمراہیوں اور خرابیوں کے

---

[۱] مفتی احمد یار خاں : علم القرآن (مطبوعہ نعیمی کتب خانہ گجرات) دیباچہ ص۴

[۲] مفتی احمد یار خاں : علم القرآن (مطبوعہ نعیمی کتب خانہ گجرات) دیباچہ ص۵

[۳] انشراح بخاری تاریخی نام ہے یعنی ۱۳۰۳ھ یہ شرح ابھی تک طبع نہیں ہو سکی ۔

پیش نظر انہوں نے یہ ضروری سمجھا کہ علمائے احناف کی طرف سے کتاب وسُنت پر تشریحی لٹریچر پیش کیا جائے اُن کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

"موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو قرآن وحدیث کے تراجم کا بہت شوق ہے ہر شخص چاہتا ہے کہ میں اپنے رب اور اپنے پیارے نبی کے کلام کو سمجھوں یہ جذبہ نہایت قابل قدر ہے مگر بعض پڑھے لکھوں نے اس سے غلط فائدے اٹھائے کہ قرآن وحدیث کے ترجموں کے بہانوں سے برے عقائد اور غلط خیالات پھیلا دیئے ۔آج مسلمانوں کے بیسیوں فرقے اور ان کا آپس میں دھول جوتا، انہی ترجموں کا نتیجہ ہیں" [1]

اس کے بعد منکرین حدیث کے فتنے کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے تمام شبہات واعتراضات کو نہایت مختصر اور فیصلہ کن بحث میں سمیٹ لیا ہے ہم یہاں اس مفید مبحث کا اقتباس تلخیص اور اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

"پھر شامت اعمال سے اب وہ بھی پیدا ہو گئے جو سرے سے حدیث کا انکار ہی کرنے لگے ان کا فتنہ بہت پھیل رہا ہے انکار حدیث پر بے شمار دلائل قائم کئے جانے لگے مگر سب کی بنیاد چار شبہوں پر ہے اگر یہ زائل ہو جائیں تو تمام اعتراضوں کی عمارت خود بخود ہی گر جاتی ہے۔

شبہ نمبر ا : قرآن مکمل کتاب ہے اور اس میں ہر چیز کا بیان ہے پھر حدیث کی کیا ضرورت ....

شبہ کا ازالہ : بیشک قرآن مکمل کتاب ہے مگر اس مکمل کتاب سے (فیض) لینے والی کوئی مکمل ہستی چاہئے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سمندر سے موتی ہر شخص

---

[1] مفتی احمد یار خان : مرآۃ شرح مشکوٰۃ (مطبوعہ نعیمی کتب خانہ گجرات) دیباچہ ص۲

نہیں نکال سکتا ۔ شناور کی ضرورت ہے ....

شبہ نمبر ۲ : رسول رب کے قاصد ہیں جن کا کام ڈاکئے کی طرح رب کا پیغام پہنچانا ہے نہ کہ کچھ سمجھانا ....

شبہ کا ازالہ : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رسول بھی ہیں، خدائی کے معلم بھی مسلمانوں کو پاک ستھرا بنانے والے بھی، رب نے فرمایا ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ[1] مشین کا استعمال سکھانے کے لئے ...... کارخانے کی طرف سے کتاب بھی دی جاتی ہے اور معلم بھی بھیجے جاتے ہیں کارخانہ قدرت کی طرف سے ..... کتاب قرآن شریف اور معلم حضور بھیجے گئے ؎

معلم خدائی کے وہ بن کے آئے   جھکے ان کے آگے سب اپنے پرائے

شبہ نمبر ۳ : موجودہ حدیثیں ، حضور کا فرمان ہی نہیں ہیں یہ تو بعد میں لوگوں نے گھڑکے بنائی ہیں ۔ کیونکہ زمانہ نبوی میں لکھنے کا اتنا رواج نہ تھا ۔

شبہ کا ازالہ : پھر قرآن کی بھی خیر نہیں ۔ کہ زمانہ نبوی میں سارا قرآن لکھا گیا نہ کتابی شکل میں جمع ہوا ......

زمانہ نبوی میں قلم سے زیادہ حافظے پر اعتماد تھا ۔ بعد میں ضرورت پیش آنے پر قرآن بھی سینوں اور کاغذ کے پرچوں وغیرہ سے جمع کیا گیا اور احادیث بھی[2] ....

شبہ نمبر ۴ : بعض حدیثیں بعض کے متعارض اور بعض عقل کے بھی خلاف ہیں لہٰذا گھڑی ہوئی ہیں ۔

اس کا ازالہ : حدیثیں صحیح ہیں آپ کے فہم میں غلطی ہے سرسری نظر سے تو قرآن کی آیتیں بھی آپس میں مخالف معلوم ہوتی ہیں کیا ان کا بھی انکار کردگے ؟ ....

---

[1] سورۂ آل عمران' آیت ۱۶۴ [2] یعنی قرآن اور حدیث دونوں کے جمع و تدوین کی نوعیت ایک ہی طرح کی ہے ۔ فطری طور پر ایک خاص دور تک زیادہ تر اعتماد متدین اور ذمہ دار لوگوں کے حافظے پر کیا گیا اور اس خاص دور کے بعد جب باقاعدہ تدوین کی اشد ضرورت در پیش آگئی تو کتابی تدوین کر لی گئی ۔

آخری گذارش: منکرین حدیث سے ایک گزارش ہے کہ ہم لمبی بحث میں نہیں پڑتے صرف دو مسئلے قرآن کے ذریعے آپ سے حل کراتے ہیں **نمبر ۱**: اسلام کا سب سے عام حکم ہے: واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ ۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو ۔ براہ مہربانی قرآنی نماز، قرآنی زکوٰۃ ادا کر کے دکھا دیجئے جس میں حدیث سے امداد نہ لی گئی ہو ۔ نماز کل کتنے وقت کی ہے اور کتنی رکعتیں ہیں ۔ زکوٰۃ کتنے مال پر کتنی ہے **نمبر ۲**: قرآن نے صرف سؤر کا گوشت حرام کیا ہے کتے، بلے اور گدھے .... کی حرمت قرآن سے دکھا دیجئے ۔ غرضیکہ چکڑالویت (انکار حدیث) صرف قولی مذہب ہے جس پر عمل ناممکن ہے [1] ۔"

اس کے بعد مفتی صاحب نے تصریح کی ہے کہ انہوں نے تصنیف و تالیف بالخصوص قرآن و حدیث پر تشریحی لٹریچر کا یہ سلسلہ تحفظ دین و مسلک کے جذبے کے تحت شروع کیا، دیکھا کہ فتنے سر اٹھائے ہوئے ہیں مگر ہمارا محاذ خاموش ہے تو اس کے سوا چارہ نہ پایا کہ اللہ کا نام لے کر انفرادی کوشش ہی سے اس بار گراں کو سنبھالنے کی ہمت کی جائے تاکہ وقت کے چیلنج کا کچھ تو مقابلہ ہو سکے اس عظیم مصنف کے درج ذیل الفاظ دیکھئے اور ان میں کارفرما دردمندانہ جذبات کا اندازہ کیجئے:۔

"ـــــ ان حالات کے ماتحت فقیر نے اپنے رب کے کرم اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی مہربانی سے قرآن شریف کے تین اگلے پاروں کی اردو زبان میں ایک مفصل تفسیر مسمیٰ اشرف التفاسیر (تفسیر نعیمی) لکھی اور تیسوں پاروں کی ایک مختصر اردو جامع تفسیر مسمیٰ نور العرفان تصنیف کی جس میں ضروریات زمانہ کے لحاظ سے فوائد و سوال جواب وغیرہ ہیں ۔ ادھر بخاری شریف کی شرح عربی میں یعنی کلام حبیب کی شرح زبان حبیب میں مسمیٰ باسم تاریخی انشراح بخاری المعروف بنعیم الباری تصنیف کی عرصہ سے خیال تھا کہ مشکوٰۃ شریف جو فن حدیث میں

---

[1] مفتی احمد یار خاں مرآۃ شرح مشکوٰۃ دیباچہ ص ۲، ۳، ۴

درس نظامی کی پہلی کتاب ہے اور کتب احادیث کی جامع ۔ جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ عرب و عجم میں ہر جگہ پڑھائی جاتی ہے اور عربی، فارسی، اردو زبانوں میں اس کی بہت شرحیں لکھی جا چکی ہیں ۔ اس کی اردو میں ایسی شرح لکھوں جو طلبا، علما، عوام المسلمین کو یکساں مفید ہو اور جس میں نئے مذاہب اور ان کے احادیث پر نئے اعتراضات کے جوابات بھی ہوں ۔ کیونکہ مرقات[1] اور "لمعات[2]" والوں کے زمانے میں دنیا کا اور رنگ تھا ۔ انہوں نے اس وقت کی ضروریات کے لحاظ سے شرحیں لکھیں ۔ نیز ہمارے عوام عربی فارسی سے واقف نہ ہونے کی بنا پر ان سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے ۔ اب دور کچھ اور ہے ۔ ہوا کا رخ دگرگوں ہے اس میں اس زمانہ کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے[3] ۔"

---

[1] مرقات عربی میں ملا علی قاری کی تالیف کردہ شرح مشکوٰۃ کا نام ہے [2] لمعات شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مصنفہ شرح مشکوٰۃ ہے [3] مفتی احمد یار خاں: مرآۃ شرح مشکوٰۃ دیباچہ صہ ۴
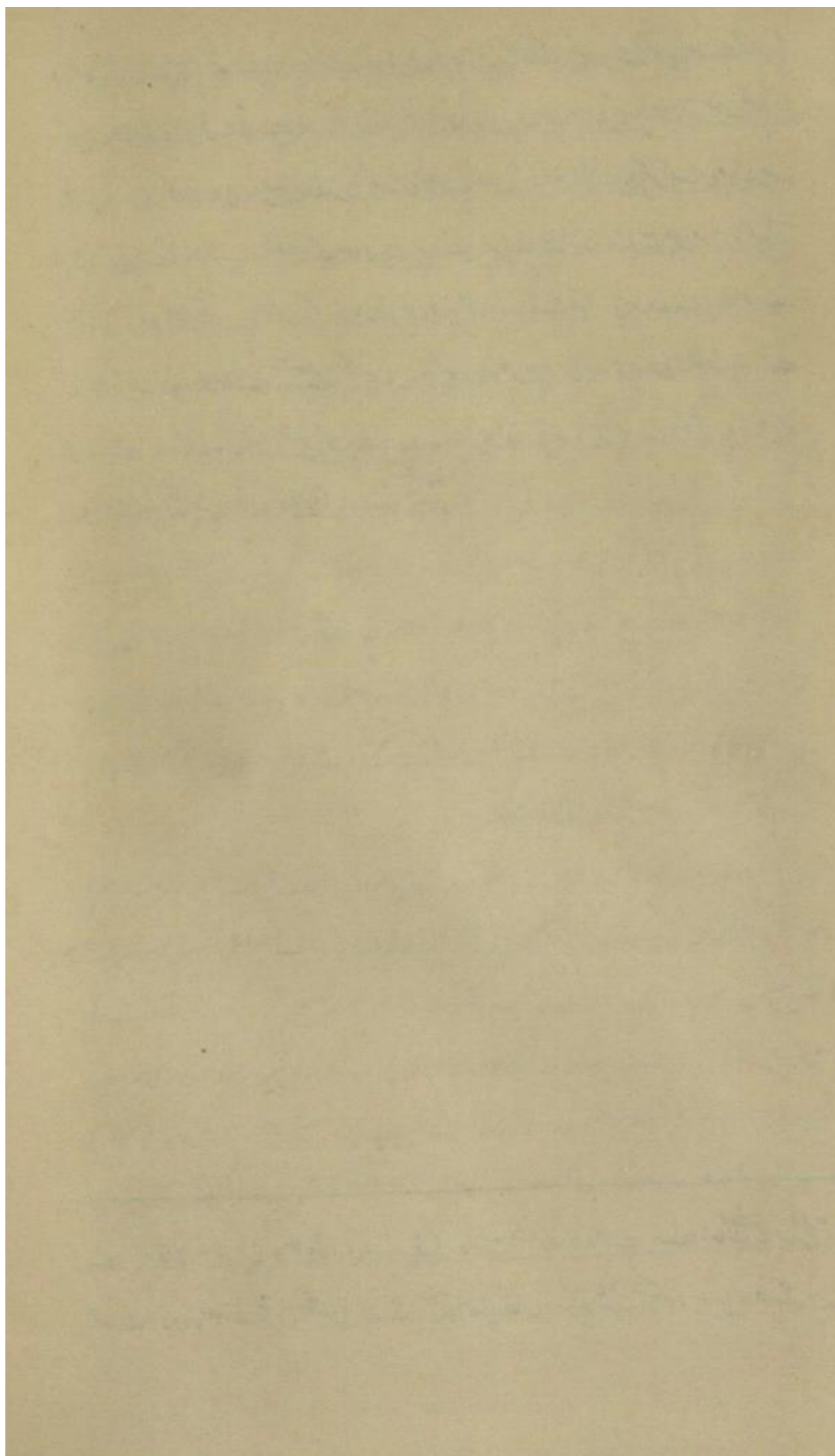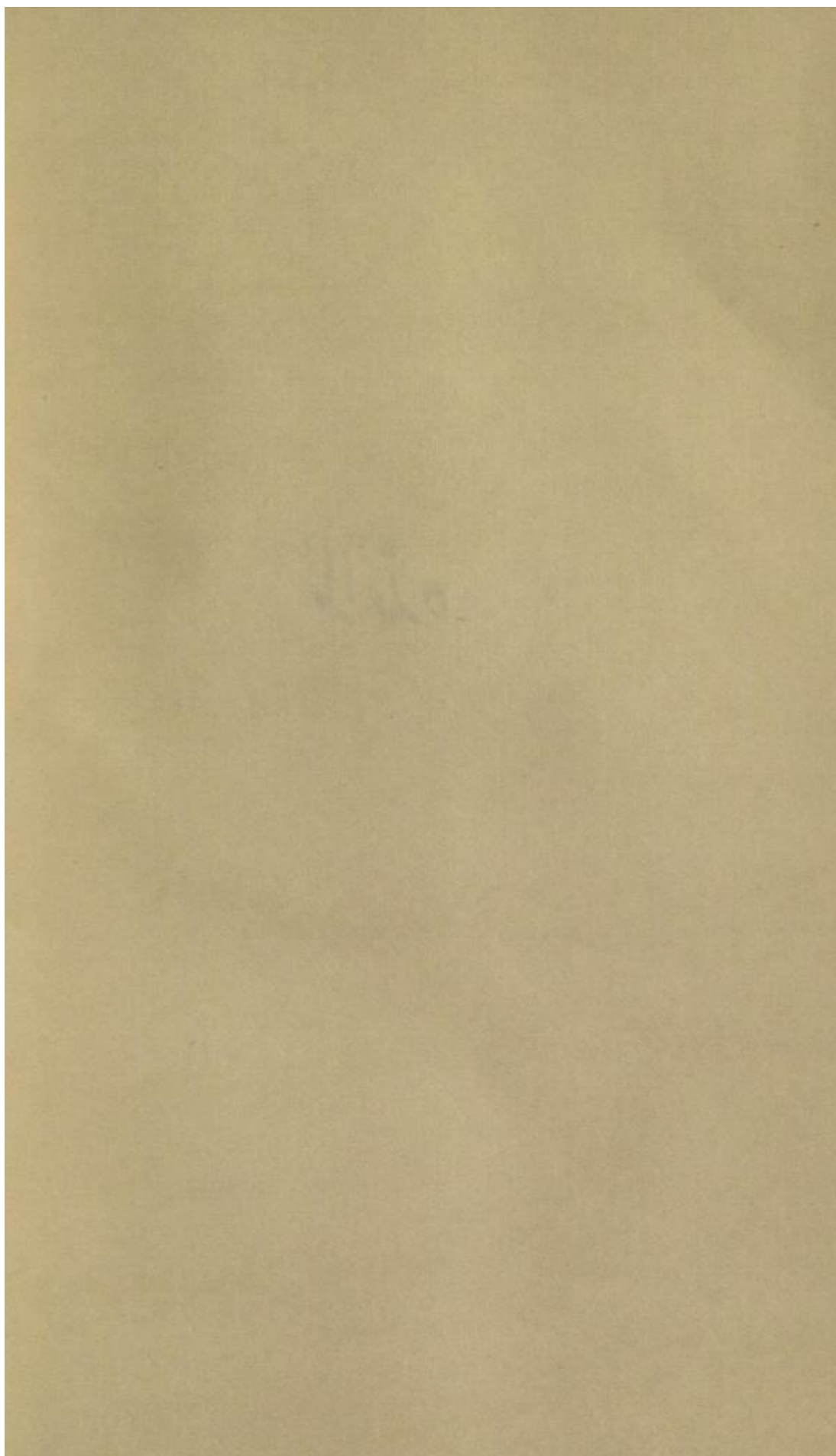
تلامذہ

{یہاں مفتی صاحب قدس سرہٗ کے تلامذہ کی وہ فہرست درج ذیل کی جاتی ہے جن کے اسماءِ گرامی چند احباب سے دریافت کرنے پر معلوم ہو سکے۔ فی الواقع فہرست اس سے بہت طویل ہے۔ اگر احباب راقم السطور سے رابطہ قائم کرکے مفتی صاحب کے تلامذہ کے مزید اسماء اور معلومات مہیا فرمائیں تو آئندہ ایڈیشن پر یہ فہرست مکمل ہو سکتی ہے۔}

تلامذہ

- مولانا عبدالکریم صاحب مدرس مدرسہ عزیزیہ ملفت گنج مشرقی پاکستان
- محمد ادریس صاحب ماریشس افریقہ
- مولانا عبدالقدیر صاحب چٹا گانگ
- مولانا لیاقت حسین صاحب مشرقی پاکستان
- حضرت پیر سید ولایت شاہ صاحب قدس سرہ العزیز
- مولانا مفتی امین الدین رحمۃ اللہ علیہ
- مولانا قاری احمد حسین رحمۃ اللہ علیہ
- (موخر الذکر تینوں بزرگوں نے گجرات کے دور میں تبرکاً مفتی صاحب سے کچھ نہ کچھ پڑھا)
- صاحبزادہ محمد مسعود الحسن صاحب چورہ شریف
- صاحبزادہ مختار اشرف صاحب کچھوچھوی
- الحاج سیٹھ ولی محمد صاحب مہتمم مدرسہ مسکینیہ دھوراجی (کاٹھیاواڑ)
- مولانا نورالدین صاحب دھوراجی
- مولانا سید جلال الدین شاہ صاحب بھکھی گجرات
- علامہ مفتی محمد حسین صاحب نعیمی جامعہ نعیمیہ لاہور
- مولانا آل حسن صاحب اشرفی نعیمی سنبھل (بھارت)
- مولانا ریاض الحسن 〃 〃 〃
- مولانا نذر محمد صاحب خطیب سلانوالہ
- مولانا غلام علی صاحب اکاڑوی
- مولانا سید غنی شاہ صاحب گجرات

- صاحبزادہ حامد علی شاہ صاحب چورہ شریف
- صاحبزادہ سید محمود شاہ صاحب گجرات
- 〃 〃 حامد علی شاہ صاحب 〃
- 〃 〃 حاجی احمد شاہ صاحب 〃
- مولانا حافظ سید علی صاحب 〃
- 〃 حافظ محمد فاضل صاحب 〃
- 〃 حافظ عبدالرشید صاحب سابو وال گجرات
- 〃 حافظ مرتضیٰ صاحب
- 〃 حافظ فضل حسین صاحب وزیر آباد
- 〃 حافظ فضل کریم صاحب گجرات
- 〃 محمد عبداللطیف صاحب
- 〃 محمد شریف صاحب گجراتی
- 〃 میر حسان الحیدری اوباڑو سکھر
- 〃 نورالدین صاحب کشمیری گجرات
- 〃 سید گلزار حسین شاہ صاحب خطیب جہلم
- 〃 حکیم غلام سرور صاحب سرگودھا
- 〃 محمد قاسم صاحب منڈی مانانوالہ
- صاحبزادہ سید شمس الحق صاحب گجرات
- قاری محمد رفیع صاحب ہریا والہ گجرات
- مولانا سید فضل شاہ صاحب گجرات

- صاحبزادہ محمد ایوب شاہ صاحب چورہ شریف
- صاحبزادہ ارشاد حسین صاحب 〃
- مولانا حافظ محمد بشیر صاحب حافظ آباد
- مولانا نذیر حسین صاحب خطیب شاہدولہ گجرات
- 〃 مظفر حسین شاہ
- 〃 محمد حسین شاہ نسیمؔ
- پیر محمد اسلم صاحب قادری مراڑیاں گجرات
- مولانا عبداللطیف صاحب قادری نکوآنی
- مولانا محمد انور نعیمی صاحب خطیب ڈسکہ
- صاحبزادہ مبارک محی الدین صاحب گجرات
- مولانا عبدالسعید صاحب کالرہ دیوان سنگھ
- مولانا محمد افضل صاحب مراڑیاں
- مولانا محمد اشرف صاحب (〃)
- مولانا عبداللطیف صاحب خطیب 〃 سائیں کانواں والا
- مولانا محمد رفیع صاحب کشمیری
- مولانا محمد شفیع صاحب کشمیری
- حافظ محمد اشرف صاحب سابق خطیب کھیوڑہ
- سید محمد قاسم خطیب بری امام راولپنڈی
- صاحبزادہ سید نظام علی شاہ (حضرو) خطیب چک لالہ

- مولانا محمد بشیر صاحب ضلعی خطیب اوقاف گجرات
- مولانا سید محمد شاہ صاحب اپر ٹوپہ مری
- مولانا سید محمد شاہ صاحب کڑیانوالہ
- صاحبزادہ مفتی مختار احمد خاں نعیمی
- صاحبزادہ مفتی اقتدار احمد خاں نعیمی
- قاضی عبدالنبی کوکبؔ
- سید صفدر حسین شاہ صاحب نوشاہی سوق کلاں
- مولانا زاہد صدیقی لاہور
- حافظ الٰہی بخش صاحب گجرات
- مولانا حافظ غلام محی الدین سائل فاروقی
- سید صابر حسین شاہ صاحب
- سید اختر حسین شاہ صاحب
- حافظ محمد نذیر احمد صاحب

شخصیت

(ایک تاثّراتی جائزہ)
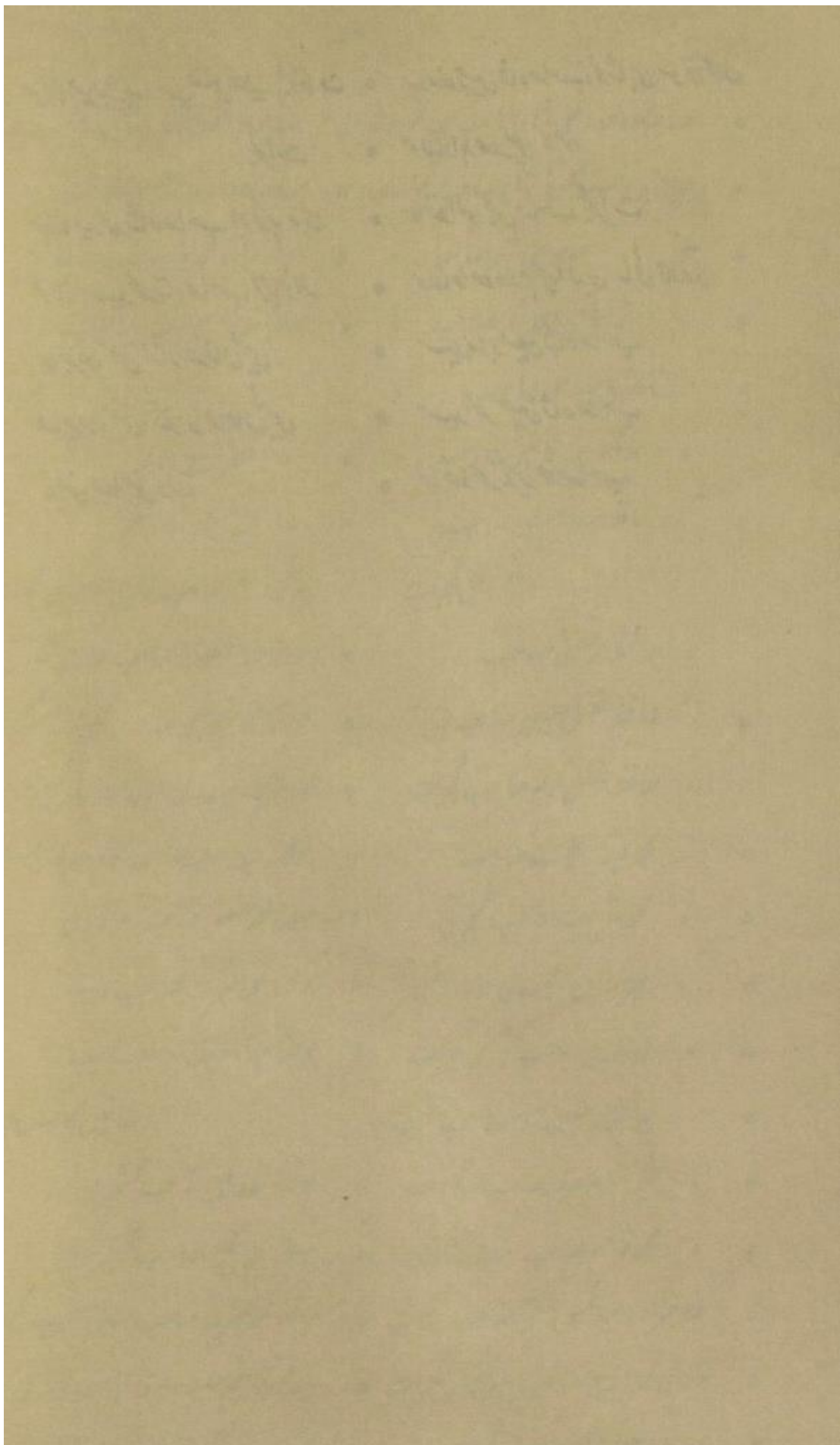
شخصیت

مفتی صاحب مرحوم کی شخصیت کا ایک اہم اور ممتاز پہلو یہ تھا کہ وہ وقت کے انتہائی قدردان اور اپنے معمولات و مشاغل کے سلسلے میں حیرت انگیز حد تک تعین وقت کے پابند تھے، علماء مشائخ اور مذہبی راہنماؤں میں بعض خاص معمولات کو چھوڑ کر زندگی کا باقی سب کاروبار بالعموم بے نظم اور پابندیٔ وقت سے بے نیاز ہی دیکھنے میں آیا ہے میرا خیال ہے کہ اس گروہ میں مفتی صاحب کا نمونہ مثالی ہے۔ انھوں نے روز و شب کے اوقات کو بڑے سلیقے سے تقسیم کر رکھا تھا پھر جو انھوں نے روز و شب کے لئے مقرر کر دیا، ہمیشہ اس کام کو اسی وقت پہ کیا جو معمولات ان کی زندگی میں داخل ہوئے، وہ آخر زیست تک اپنے اپنے مقررہ اوقات پر ہی انجام پاتے رہے۔ سحری کے وقت تہجد کے لئے فجر سے تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے بیدار ہو جاتے، تہجد سے فارغ ہو کر ذرا استراحت فرماتے فجر کا وقت ہو جاتا تو سنّتِ فجر گھر پہ ادا کر کے نماز کے لئے مسجد تشریف لے جاتے۔ نماز فجر سے فارغ ہو کر قرآن حکیم کا (اور آخری دَور میں حدیث شریف کا بھی) درس دیتے، درس سے فارغ ہو کر گھر میں ناشتہ کرتے۔ ناشتے کے بعد اسباق پڑھانے کے لئے بیٹھ جاتے۔ اسباق سے فارغ ہوتے، تو تصنیف و تالیف کے کام کا ایک حصّہ انجام دیتے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر قیلولہ فرماتے،

اور نماز ظہر[2] کے بعد تصنیفات کا باقی کام لے کر بیٹھتے۔ فتویٰ نویسی اور خطوط کے جواب بھی بالعموم اسی وقت تحریر فرماتے۔ عصر کی نماز پڑھ کر، گھومنے کے لئے باہر نکل جاتے۔ سیر سے واپس آکر مسجد میں نمازِ مغرب پڑھتے۔ اور پھر گھر تشریف لاکر کھانا کھاتے۔ عشاء کی نماز[3] کے بعد جلد بستر میں چلے جاتے۔

یہ ایک سیدھا سادھا آسان پروگرام دکھائی دیتا ہے، اور مفتی صاحب مرحوم کی زندگی ایسی ہی سیدھی سادھی اور آسان تھی۔ مگر کمال یہ تھا، کہ مذکورہ معمولات میں سے ہر معمول، ہمیشہ کا معمول تھا، اور وہ ہمیشہ اسی وقت پر ادا کیا جاتا تھا، جو ایک دفعہ اس کے لئے مقرّر کر دیا گیا تھا۔ حتّٰی کہ تقریباً ہر کام کے آغاز کا وقت معیّن تھا، تو اس کے انجام کا وقت بھی مقرّر تھا۔ عصر کی سیر کے لئے آخری چند برس سے حافظ سیّد علی صاحب ساتھ جاتے تھے۔ اُن کا بیان ہے، کہ ہر روز مقرّرہ وقت پر سائیں کانواں والے (مرحوم و مغفور) کے مزار پر پہنچتے اور واپسی پر اپنی مسجد میں اکثر اُس وقت تشریف لاتے کہ ادھر آپ دروازے میں داخل ہوئے اور اُدھر مؤذن نے مغرب کی اذان شروع کی۔ مجھے آپ نے خود یہ دلچسپ بات سنائی کہ ایک روز سیر سے واپس آتے ہوئے، میں نے ایک کاشت کار کو سُنا کہ وہ اپنے لڑکے سے کہہ رہا تھا:

"اوہ مُنڈیا کٹا چھڈ اوئے، مفتی صاحب واپس لنگ گئے نیں۔"

یعنی کاشت کار مفتی صاحب کی واپسی کے وقت کو غروبِ آفتاب کی علامت قرار دے کر لڑکے سے کہہ رہا تھا، کہ جلدی کرو، بھینس کے لئے بچھڑا کھول دو (دودھ

---

[2] نمازِ ظہر کے بعد تھوڑی سی چہل قدمی کمرے کے اندر ہی فرماتے طلبہ کے اسباق اور درسِ قرآن کیلئے مطالعہ بھی، بعد نمازِ ظہر اور کبھی کچھ کام قبل نمازِ فجر بھی کر لیتے۔

[3] بالعموم اس وقت ریڈیو سے خبریں سُن لیا کرتے تھے۔

دوبجنے کا وقت ہوچکا ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ مفتی صاحب ایک سے زائد گھڑیاںؑ اپنے ساتھ رکھتے۔ ایک گھڑی کلائی پر اور دوسری جیب میں۔ جیب کی گھڑیاں بعض اوقات دو ہوتیں۔ وفات کے وقت اُن کے پاس تین گھڑیاں پائی گئیں۔ ان گھڑیوں کا وقت درست رکھنے کا اہتمام فرماتے، اور اُن کا باہم مقابلہ بھی کرتے تھے، گھڑی اور وقت کا یہ سارا اہتمام، دراصل نماز اور جماعت کے مسئلے سے متعلق تھا۔ انھوں نے ہر نماز کے لئے مسجد میں پہنچنا ہوتا تھا، مگر کام کرتے کرتے اُٹھ کر جانا ہوتا تھا، پھر وضو گھر پر کرتے اور سنّت و نوافل بھی گھر پر ہی ادا کرتے۔ اس طرح انہیں ایک ایک منٹ کا حساب اور صحیح اندازہ رکھنا پڑتا تھا۔ اور اب یہ سب کچھ ان کی عادت میں داخل ہوکر طبیعت ثانیہ بن چکا تھا۔

مفتی صاحب ان پارسا لوگوں میں سے تھے۔ جن کے لئے شریعت بمنزلۂ طبیعت کے بن جاتی ہے۔ نماز، تلاوت، درود شریف اور حج و زیارت کے ساتھ انھیں بے پناہ شغف تھا۔ "ایک ہے نماز پڑھنا اور ایک ہے نماز قائم کرنا" ان دونوں میں جو فرق ہے، ہم لوگ اُسے اپنی تحریر و تقریر کا موضوع تو بنا ہی لیتے ہیں، مگر اس فرق کا عملی نمونہ اور نماز قائم کرنے کا صحیح مفہوم ہم نے اپنے اس دَور میں، مفتی صاحب کی نماز کو دیکھ کر معلوم کیا۔ وہ نماز ادا کرتے، جو اُن تمام آداب اور متعلقات سمیت ادا کرتے، جن کی رعایت ملحوظ رکھنے کی شریعت نے ہدایت کی ہے۔ وضو کرتے، تو اس میں مسواک تک کی پابندی نباہتے۔ وضو گھر پر کرتے، اور سنن و نوافل گھر میں ادا کرنے کے بعد مسجد میں پہنچتے

ؑ اسی طرح ان کے کمرے میں چارپائی کے قریب الارم والے دو ٹائم پیس رکھے ہوتے تھے، ایک تہجد کے وقت کے لئے اور دوسرے پر فجر کے وقت کے لئے الارم لگا رہتا۔

تکبیرِ اولیٰ کبھی فوت نہ ہونے دیتے۔ پہلی صف میں امام کے پیچھے بیٹھتے۔ امامت خود نہیں کراتے تھے، اقامت بھی اکثر و بیشتر دوسروں ہی کو پڑھنے دیتے۔

نماز اُن کی طبیعت میں یوں داخل ہو گئی تھی، کہ جب پہلی بار آپریشن کے لئے میو ہسپتال میں داخل ہوئے، اور آپریشن ہوا، تو مجھے اچھی طرح یاد ہے، کہ آپریشن کے بعد کوئی سات آٹھ نمازیں، وقت پہ ادا نہ کر سکے، کیونکہ ہلنے جُلنے کی ممانعت تھی۔ تو بار بار قلق کے ساتھ کہتے رہے "بھائی یہ کیا ہو رہا ہے، یہ میری ہوش میں پہلا موقع ہے کہ اتنی نمازیں اکٹھی قضا ہوئی ہوں"۔ عرض کیا جاتا۔ یہ تو واقعی مجبوری اور معذوری کی حالت ہے، آخر شریعت کی طرف سے ایسے ہی مواقع کے لئے رعایت رکھی گئی ہے" یہ بات سُن کر خاموش تو ہو جاتے، مگر ان کی دلی بے قراری چھپائے نہ چھپتی تھی۔ جیسے ہی بیٹھنے کی ہمت آئی، اشاروں سے نماز پڑھنی شروع کر دی۔ اور جب آخری بار (اکتوبر ۱۹۷۰ء میں) آپریشن ہوا، تو آپریشن کے بعد پہلی رات ہی مجھے فرمانے لگے "دیکھو آج میری تین نمازیں چھوٹ گئی ہیں عصر، مغرب، عشاء، اب بتاؤ اگر میں اسی حالت میں مر جاؤں، تو ان نمازوں کا کیا بنے گا؟" میں تصویرِ حیرت بنا اُن کا سوال سنتا رہا، مگر جواب کچھ نہ دے سکا۔

دیگر نوافل بھی التزام ہی سے پڑھتے، مگر تہجد کی رغبت کا یہ عالم تھا، کہ سفر میں ہوں یا حضر میں، پچھلی رات کو اپنے وقت پر اُٹھ کھڑے ہوتے۔ یہی آپریشن کی آخری بار کے لئے جب لاہور تشریف لائے تو ۳۔اکتوبر کی شام کو ہمارے مکان پر قیام فرمایا۔ عشاء کے بعد سونے سے پہلے کہا: "میری چارپائی کے پاس لوٹا اور مصلّیٰ رکھ دیا جائے، میں انشاءاللہ رات کو دو بجے کے قریب اٹھوں گا"۔ چنانچہ وہ ٹھیک دو بجے اُٹھے، اور جب میں بھی اٹھ بیٹھا، تو مجھے جلد ہی سونے کے لئے کہا۔

قرآنِ حکیم سے گہرا تعلقِ خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ طالب علمی کے دور کے بعد انھوں نے عمر بھر ہر روز قرآن حکیم کا درس دیا۔ جس میں ناغہ بہت کم ہونے دیتے تھے، علاوہ ازیں

پچھلے بیس پچیس برس سے تفسیر نعیمی کی تصنیف کے سلسلے میں بھی قرآن اور اس کی تفاسیر سے رابطہ رہتا تھا، مگر ان سب چیزوں کے باوجود، مفتی صاحب، قرآن پاک کی روزانہ تلاوت بھی فرماتے، اور ایسی پابندی سے فرماتے، جیسی پابندی فرائض کی کیجاتی ہے۔ ہسپتال داخل ہونے سے پہلے، جو رات ہمارے مکان پر گزاری، اس کی صبح کو بھی انھوں نے قرآن حکیم مانگا۔ اور جب میں نے اعلحضرت فاضل بریلوی کے ترجمے والا نسخہ لاکر رکھا، تو بہت خوش ہوئے اور اپنا مقررہ وظیفۂ تلاوت پورا فرمایا۔ ہسپتال میں پہنچے۔ تو سوچتے ہی رہے کہ یہاں قرآن حکیم کا نسخہ اگر لایا جائے تو رکھا کہاں جائے گا۔ ادب و احترام محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ اور ایک دن فرمانے لگے "بھائی! یہاں یہ بڑی محرومی ہے کہ تلاوت کے لئے قرآن حکیم نہیں رکھا جاسکتا"

تلاوت کے بعد، مفتی صاحب کا محبوب ترین وظیفہ درود پاک تھا۔ بلکہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ درودِ پاک کے ساتھ انھیں ہر چیز سے زیادہ بڑھکر پیار تھا، تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر حالت میں درود پڑھتے رہتے تھے، بلکہ گفتگو کرتے ہوئے بھی درود پڑھ لیتے اور وہ اس طرح کہ جب مخاطب بات کرنے لگتا، اور انھیں اس کی بات سننے کے لئے خموشی کا وقفہ ملتا، تو اسی میں درود جاری رہتا۔ بعض لوگ یہ احساس پیش کرتے ہیں، کہ چلتے پھرتے درود پڑھنا نامناسب معلوم ہوتا ہے، سکون اور ادب کے ساتھ کہیں بیٹھ کر ہی پڑھا جاسکتا ہے۔ مگر مفتی صاحب نے ایسی باتوں کو کبھی اہمیت نہ دی، اور وہ حرکت و سکون، ہر کیفیت میں ذکرِ درود سے کبھی خالی نہ ہوتے۔ کبھی یہ کہا جاتا، کہ اگر وضو نہ ہو تو درود پڑھنا بند کر دینا چاہیئے۔ تو آپ جواب دیتے، جو شخص پاک پانی میں غوطہ زن ہوجائے، کیا وہ آلودگیوں سے پاک نہیں ہوجاتا۔ اسی طرح درودِ پاک، نور و طہارت کا دریا ہے۔ جو اس میں آیا، خود بخود پاک ہوگیا۔ فی الواقعہ اس وظیفے سے انھیں عشق تھا، ذرا غور کیجئے۔ نیند کی حالت میں، کیا کیفیت ہوتی ہوگی یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے مگر جاگتے ہوئے، مفتی صاحب کی زبان، ہر وقت ذکر و عبادت

میں مصروف رہتی تھی۔ اُن کی زبان دن کے جاگتے حِصّے میں، یا درسِ قرآن دے رہی ہوتی، یا کسی فقہ وحدیث کے اسباق پڑھاتی، یا کسی تالیف کی عبارت اِملا کراتی، یا کسی سائل کو مسئلہ بتاتی، اور یا پھر درود پاک پڑھ رہی ہوتی تھی۔

فریضۂ حج کے ساتھ بھی خصوصی تعلق تھا۔ اور اُس کے پس منظر میں حرمین شریفین بالخصوص مدینۃ الرسول کی حاضری کا ذوق وشوق کار فرما ہوتا تھا۔ مفتی صاحبؒ کو پانچ بار حج کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ پہلی بار اُن ایّام میں گئے، جبکہ وہ دھوراجی (کاٹھیاواڑ) میں مدرّس ہوتے تھے۔ اور اس کے بعد چار مرتبہ گجرات سے تشریف لے گئے۔ انھوں نے ایک حج اپنے والد کی طرف سے، ایک حضور کی طرف سے اور ایک حضور کی ازواجِ مطہرات کی طرف سے ادا کرنے کی نیّت کی تھی۔ یہ حج ہی کی دلچسپی تھی کہ مفتی صاحب، حسبِ اِستطاعت رقم جمع کرتے رہتے تھے۔ اور جو کچھ جمع فرماتے تھے، گھریلو ضروریات کے بعد، اُس کا سب سے بڑا مصرف یہی سفرِ حرمین ہوتا تھا۔

نماز اور اذکار وعبادات کی پابندی کے باوجود طبیعت میں زاھدانہ خشکی اور تقشّف نے راہ نہیں پائی تھی۔ احباب، رفقاء اور تلامذہ میں گھُل مِل کر بیٹھتے۔ ملتے تو مسکراتے ہوئے چہرے سے ملتے۔ البتہ مسکراہٹ بالعموم زیرِلبی ہوتی۔ کھُل کر ہنستے تو بھی قہقہے کی حدود کو بمشکل ہی چھوتے۔ بچوں سے ایک خاص انداز کی شفقت کی باتیں کرتے۔ گھر کے چھوٹے بچے اُن سے بہت اُنس اور دوستی رکھتے تھے۔ نوجوانوں کو محبّت اور حکمت کے امتزاج سے خطاب کرتے۔ بڑوں کا احترام کرنے میں اور چھوٹوں پر دستِ شفقت رکھنے میں اُن کا قدم تیزی سے آگے بڑھتا۔ جس روز اپریشن ہُوا، تو کمرے سے باہر مفتی صاحب مرحوم کی بڑی ہمشیرہ بھی تشریف فرما تھی۔ اپریشن کے بعد جب انھیں چارپائی پر باہر لایا گیا تو ہمشیرہ نے پوچھا: احمد یار کیسے ہو؟ مفتی صاحب نے

لب کی جنبش اور ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا: "الحمد للہ بالکل ٹھیک ہوں" بعد میں ہسپتال ہی میں ایک موقع پر مجھے فرمایا: "انسان کی یہ بھی کیسی عجیب خواہش ہوتی ہے، کہ اُس کے سر پر کوئی بڑا موجود ہو۔ جو شفقت اور پیار سے اُسے پکارے۔ تمہیں نام لے کر پکارنے والا میرے سوا اور تمہاری والدہ کے سوا اور کوئی نہ ہوگا اور مجھے میری بڑی ہمشیرہ کے سوا نام سے پکارنے والا اب اور کوئی نہیں۔ اپریشن کے دن آپا نے جب مجھے احمد یار کر کے پکارا، تو مجھے یوں لگا کہ میرا بہت سا خون بڑھ گیا ہے۔ بڑوں کی شفقت بھی کیسی نعمت ہے"

والدہ مرحومہ[1] کو فوت ہوئے اب ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ مگر اکثر و بیشتر ان کی یادوں سے دل کو تقویت دیتے ہوئے، ان کے لئے دعائے مغفرت کرتے، اور فرمایا کرتے کہ میرے پاس جو کچھ ہے سب ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

طبیعت میں نمود و اظہار کے شوق کے لئے کوئی خانہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ تقریباً ۳۰ برس سے گجرات میں تشریف فرما تھے اور ٹھوس علمی و دینی خدمات انجام دے رہے تھے مگر اخبار اور اشتہار کا موضوع بننے کی کبھی کوشش نہ کی۔ لاہور ہسپتال میں داخل ہوئے۔ تو عرض کیا گیا کہ اخبارات میں بیماری کی اطلاع شائع کرائی جائے۔ اور دعائے صحت کی اپیل کی جائے تو اُسے بھی پسند نہ فرمایا۔ سیاست و صحافت کے معرکوں سے دُور رہتے، انھوں نے کبھی دوسروں پر اپنی شخصیت ٹھونسنے کی، یا علمی رعب جمانے کی کوشش نہ کی۔ اپنی اس خاص افتادِ طبع کے باوجود آپ روزانہ اخبار خود بھی دیکھتے اور ملنے والوں سے بھی معلومات لے لیتے۔ تا بحدِ ضرورت ملکی و ملّی حالات سے باخبر رہتے تھے۔ سیاسی اور ملکی مسائل پر دوستوں سے تبادلہ خیال بھی فرما لیتے۔ بے خبر رہنے کو مستحسن قرار نہیں دیتے تھے اور یہ مصرعہ پڑھا کرتے تھے۔

---

[1] مفتی صاحب کی والدہ مرحومہ ۱۹۴۷ء میں فوت ہوئی تھیں۔

خلق "علم شے بہتر بود از جہلِ شے"۔ مگر وہ اِس فرق سے خوب واقف تھے کہ فرائض کی بہتر ادائیگی کے لئے ماحول سے با خبر ہونا اور چیز ہے، مگر باخبری کے بہانے نمود و اقتدار کا پجاری بن جانا ایک دوسری چیز ہے۔

جس دَور میں مذہبی رہنماؤں کے اکثر گروہ، خود غرضانہ سیاسی طالع آزمائی، اور شخصی یا گروہی مفادات کے حصول کے لئے، انتخابی معرکوں میں کود پڑے تھے، مفتی صاحب اس سارے ہنگامے میں، کمالِ خاموشی کے ساتھ، اپنے گوشۂ تصنیف میں حسبِ دستور مصروفِ کار رہے۔ فرمایا کرتے تھے "میں تو دیہات کی پُرسکون زندگی پسند کرتا ہوں" اور اس سے کسی طرح کی جمود پرستی اور عزلت پذیری کی حوصلہ افزائی مُراد نہ تھی۔ بلکہ شر اور فتنے سے بچنا مقصود تھا۔ اپنی تبلیغی زندگی کے آغاز میں انھوں نے بحث و مناظرہ کے کئی معرکے سَر کئے تھے۔ فنّی اصُول اور تبحرِ علمی کی رُو سے مفتی صاحب میں ایک کامیاب مناظر کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ مگر جیسے جیسے کاروانِ عمر آگے بڑھتا گیا، طبیعت کا درویشانہ رجحان، بحث و مناظرہ کے میدانوں سے انھیں دُور ہی دُور لیتا گیا۔ بلکہ ہوتے ہوتے، عام جلسوں اور تقریروں سے بھی کنارہ کش رہنے لگے تھے۔ اور آخری سالوں میں یہ کیفیت تھی، کہ سال بھر میں بمشکل دو تین دفعہ باہر کے جلسوں میں شرکت کے لئے نکلتے۔ اور وہ بھی صرف مخلص ترین احباب کے ہاں۔ نماز کے لئے ہمیشہ مسجد میں تشریف لے جاتے، اور جماعت کے ساتھ ہی نماز ادا فرماتے۔ مگر خود جماعت کی امامت کبھی نہ کراتے۔ شاذ و نادر ہی ایسا کوئی موقعہ آتا، کہ کبھی سفر وغیرہ میں میزبانوں کے اصرار پر جماعت کرانا قبول فرماتے۔ اور یا کسی ایسی مجبوری کی حالت میں، کہ امامت کے لئے دوسرا متشرّع آدمی ہی موجود نہ ہوتا۔

لباس اور وضع میں کسی نوع کا تکلف نہ برتتے، نہ متمولانہ، نہ زاہدانہ و عالمانہ۔ متمولانہ تکلّف سے میری مراد یہ ہے کہ جگڑے ہوئے نوابوں کی طرح انتہائی بیش قیمت

کپڑے پہنے جائیں۔ اور زاھدانہ و عالمانہ تکلّف سے مراد یہ ہے کہ جُبّہ و دستار کا خاص اِلتزام اور لباس کی ایک خاص طرح کی ساخت اور پھر اُس پہ بیچ وخم کا خاص اہتمام لازم سمجھا اور رکھا جائے۔ مرحوم ایسی باتوں سے کوسوں دُور تھے۔ ماہیّت کے اعتبار سے اُن کا لباس معمولی اور درمیانہ ہوتا۔ جس میں ساخت یا قرینہ داری کو بھی کوئی خاص اہمیت نہ دی جاتی۔ بے کالر کی قمیض، کُرتہ، شلوار، پاجامہ سب کچھ پہن لیتے۔ پنجاب میں آکر انھوں نے بتدریج اِدھر ہی کا لباس اپنا لیا تھا۔ اور اب سالہا سال سے پنجابی انداز کی شلوار استعمال فرماتے تھے۔ موسمِ گرما میں دیسی ملّ کا کُرتہ پہنتے تو اُسے استری لگی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اکثر وبیشتر اُن کے کپڑے اُجلے ضرور ہوتے، مگر مایہ اور استری سے بے نیاز ہی رہتے۔ ہندوستان سے تشریف لائے تو شروع میں کچھ دیر تک شیروانی پہنتے رہے۔ لیکن اب آخری سالوں میں شیروانی بھی شاذ ونادر ہی دیکھی گئی۔ سردیوں میں بالعموم پنبہ دار واسکٹ اور جرسی وغیرہ استعمال کر لیتے تھے۔ انھوں نے اس بات کا اظہار کبھی نہیں کیا کہ میں شیروانی اور جبّہ وقبا سے اس سیدھے سادھے عام لباس کی طرف کیوں منتقل ہُوا ہوں۔ اور یہ اظہار اس لئے نہیں تھا کہ ان کا راستہ اظہار اور دعوے کا راستہ نہیں تھا۔ مگر بالیقین یہ سب کچھ اپنے تہذیبی جذبے کے پیشِ نظر تھا۔ مفتی صاحب مرحوم سے بڑھکر کون اس بات سے آگاہ ہو سکتا تھا کہ اُن کے آقا حضورِ رحمۃ اللعالمینؐ نے ارشاد فرمایا تھا:

"جو شخص فخر و امتیاز کا لباس پہنے گا۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اُسے نظرِ رحمت سے نہیں دیکھے گا۔"

ہمارے علماء اور صوفیاء کی سادہ لباس اور درویش وضع کے پیچھے یہی عظیم فرمانِ رسول کارفرما رہا ہے۔

اس سال مجلسِ صداقتِ اسلام کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے یومِ رضا کے موقع

پر جب مفتی صاحب دورانِ جلسہ برکت علی اسلامیہ ہال میں تشریف لائے تو ایک دیدنی منظر آنکھوں نے دیکھا۔ مائیک سے مفتی اعظم پاکستان کی آمد کا اعلان ہوا اور نگاہیں کسی بہت بڑی مرصّع اور سج دھج والی شخصیت دیکھنے کے منتظر تھیں۔ مگر دیکھا یہ گیا کہ اس نام سے ایک ایسا شخص سٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا، جس کا لباس سادہ اسے زینتِ فقر بخشے ہوئے تھا۔ ہمارے جو دوست گجرات سے مفتی صاحب کے ہمراہ آئے انھوں نے بتایا کہ مفتی صاحب نے جن کپڑوں میں صبح کی نماز پڑھی اور قرآنِ حکیم کا درس دیا، انہی کپڑوں میں اٹھکر وہ لاہور تشریف لے آئے تھے۔

مفتی صاحب کی عادات کے بعض گوشے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جس ماحول میں وہ زندگی گزار رہے تھے۔ کس طرح اُس ماحول کے بنائے ہوئے عام سانچوں سے ان کے اطوار مختلف تھے۔ علماء اور مشائخ کے لئے استقبال اور مشایعت کی رسمیں عام ہیں معتقدین کی طرف سے دعوتوں اور کھانوں کا سلسلہ بھی رواج کا ایک حصّہ ہے لیکن اس رواج اور اس ماحول میں مفتی صاحب کی حساس طبیعت اور بیدار ضمیر انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کہ ان کے لئے کوئی دوسرا شخص زحمت میں پڑ جائے۔ یومِ رضا سے فارغ ہو کر گجرات واپس تشریف لے گئے تو اقبال صاحب ان کے ہمراہ گئے بس سے اُترے تو فرمایا کہ پیدل ہی گھر تک جائیں گے۔ راستے میں اقبال صاحب کا محلہ آیا تو فرمایا کہ اب آپ اپنے گھر جائیں اور میں اکیلا چلا جاؤں گا۔ اقبال صاحب نے انتہائی خواہش ظاہر کی کہ وہ آپکو گھر چھوڑ کر واپس آجائیں گے اور بات بھی معمولی تھی لیکن مفتی صاحب نے انھیں ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔ اور اپنا بیگ خود اٹھائے ہوئے کھلے بازار سے گزرتے ہوئے گھر تشریف لے گئے۔

آپریشن کے لئے آخری بار لاہور آئے تو رات میرے مکان پر ٹھہرے۔ سحری کو تہجد

کے لئے اُٹھے تو میری بھی آنکھ کھل گئی۔ لوٹا لے کر وضو کرانا چاہا۔ مگر آپ نے مجھے اصرار سے کہا کہ تم سو جاؤ۔ تم نے صبح کام پہ جانا ہوگا۔ ہسپتال میں داخل ہوئے تو مناسب یہ سمجھا گیا کہ پکا ہوا کھانا ہسپتال میں پہنچایا جائے۔ دوپہر کا کھانا احمد حسن صاحب نوری کے گھر سے اور شام کا کھانا میرے ہاں سے آنا طے پایا۔ اوّل تو مفتی صاحب گھر کے کھانے کی تجویز کو مانتے ہی نہ تھے، فرماتے، "ہسپتال کا کھانا مجھے پسند ہے تو پھر آپ لوگ کیوں تکلیف میں پڑتے ہیں۔" بڑی مشکل سے بار بار زور ڈال کر انھیں آمادہ کیا گیا۔ ہمارے اصرار پر مان تو گئے اور گھر کا کھانا کھاتے بھی رہے۔ لیکن یہ احساس انھیں ستاتا ہی رہا کہ ان کی وجہ سے دوسرے لوگ زحمت اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ بار بار فرماتے رہے کہ "بھائی تم لوگ خواہ مخواہ تکلیف اٹھا رہے ہو ہسپتال میں اچھا بھلا کھانا ملتا ہے۔" یہ سب ان کے احساس کا مسئلہ تھا۔ ورنہ ہمارے گھروں کا ہر چھوٹا بڑا فرد، مفتی صاحب کی ہر خدمت کو اپنے لئے باعثِ سعادت اور موجبِ راحت تصوّر کرتا تھا۔ وہ کسی کو خدمت کا موقع دیتے ہی کب تھے؟ میں ان کا ایسا شاگرد تھا، جسے اپنی طالب علمی میں، ان کے انتہائی قریبی ماحول میں رہنے کا شرف حاصل تھا۔ مگر تمام تر دَورِ طالب علمی میں، مجھے خدمت کے لمحات میسر نہ آسکے۔ یہ ایک اتفاق تھا، کہ میرے قیام لاہور کے دَوران میں مفتی صاحب کو دو بار آپریشن کے لئے میو ہسپتال میں داخل ہونا پڑا، پہلی بار غالباً ۱۹۵۷ء میں اور دوسری بار اَب اکتوبر ۱۹۷۱ء میں۔ بس یہ دو مختصر وقفے ساری عمر میں، مجھے ایسے نصیب ہوئے کہ استادِ گرامی کی خدمت کا کچھ حصّہ ادا کر سکوں۔ مگر اس میں بھی ان کی حسّاس اور خود دار طبیعت ہر لمحے پُر شوقِ بے تاب کے لئے رکاوٹیں پیدا کرتی رہی۔

من کی دنیا

(حافظ سید علی صاحب کے تاثرات کے آئینے میں)

مفتی صاحب قدس سرہٗ نے عالمِ رنگ و بو سے بہت دُور من کی جو دنیا بسا رکھی تھی اس کا علم بہت کم لوگوں کو تھا۔ وہ دعوے اور اظہار کا مزاج نہیں رکھتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ صاحبِ دل لوگ اپنے کو اشتہار بنانا کبھی پسند نہیں کرتے۔

ع آنرا کہ خبر شد، خبرش باز نیامد

مفتی صاحب کے ہاں من کی دنیا کی ساری رونق سرورِ کونین حضور رحمۃ للعٰلمین کے تعلق اور وابستگی سے قائم تھی۔ انہیں اپنے آقا و مولا کے ساتھ جو بے پناہ عقیدت و محبت تھی، اس کے فیض سے بالآخر انہیں قرب و تعلق کی خاص کیفیات عطا ہونے لگی تھیں جس کا اظہار ان حسین و جمیل خوابوں سے ہوتا ہے جن سے مفتی صاحب قدس سرہٗ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں بکثرت مشرف ہونے لگے تھے۔ ان خوابوں میں حضور پُر نور اور آپ کے خاصانِ بارگاہ کی زیارات نصیب ہوتیں مفتی صاحب قدس سرہٗ اپنی ان کیفیات رؤیا کا تذکرہ کبھی کبھی چند خاص احباب سے فرماتے رہے، جو گجرات میں اُن سے بہت قریب تھے۔ میرے محترم اور بزرگ ساتھی، استاذ بھائی مولانا حافظ سید علی صاحب بھی ان خوش نصیب لوگوں میں ہیں جن کے ساتھ مفتی صاحب ان کیفیات خصوصی کا کچھ تذکرہ فرماتے رہے۔

میں مفتی صاحب قدس سرہٗ کے مقاماتِ قرب کے بارے میں کچھ کہنے سے بہت

ڈرتا ہوں مبادا کہ یہ اظہار و دعویٰ کی وہی بات بن کر رہ جائے جسے مفتی صاحب سخت ناپسند فرماتے تھے، اس لئے صرف حافظ صاحب کے ذریعے سے چند خواب نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ جو مفتی صاحب نے خود بیان فرما دیئے تھے۔ یہ محض ایک جھلکی ہے اور سرِ دست اس سے زیادہ تفصیلی بیان ممکن نہیں ورنہ یہ سمندر ناپیدا کنار ہے ؎

اندکے پیشِ تو گفتم غمِ دل ترسیدم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است
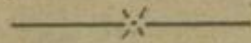
جب مفتی صاحب قدس سرہٗ نے "امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر ایک نظر" کتاب تالیف فرمائی، تو اس موقع پر رات زیارت نبوی سے مشرف ہوئے۔ سرکار فرما رہے تھے: "تم نے میرے صحابی کی عزت بچانے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تمہاری عزت بچائے گا"
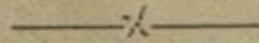
تفسیر نعیمی کی تالیف کے موقع پر یا اس سے کچھ بعد، خواب میں دیکھا کہ اجمیر شریف کی درگاہ میں ہیں، حضرت خواجہ قدس سرہٗ برآمدہ کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ ادھر سے حضور پُرنور تشریف لے آئے۔ مفتی صاحب کی طرف سے حضرت خواجہ نے تفسیر نعیمی کا نسخہ دربارِ رسالت میں پیش کیا اور سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے دستِ مبارک میں لے لیا۔
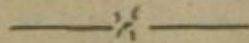
ایک دفعہ مفتی صاحب خشکی کے راستے زیارت حرمین کے لئے تشریف لے گئے اس موقع پر آپ طویل عرصے تک مدینہ منورہ میں ٹھہرے رہے اور جی یہی چاہتا تھا کہ کوئی صورت نکلے تو یہیں ہمیشہ کی سکونت ہو جائے کہ مسجد نبوی کے قریب رہنے والے کسی صاحب کو خواب میں حضور کی زیارت ہوئی اور فرمانے لگے: "مفتی صاحب سے کہا جائے

وہ گجرات جائیں اور تفسیر کا کام کریں۔" یہ فرمان دوسرے روز مفتی صاحب تک پہنچا دیا گیا۔ مفتی صاحب کو از حد اطمینان ہوا کہ اگر سرکار کا یہ فرمان ہے کہ گجرات جاؤ تو پھر گجرات ہی میرے لئے مدینہ ہے۔
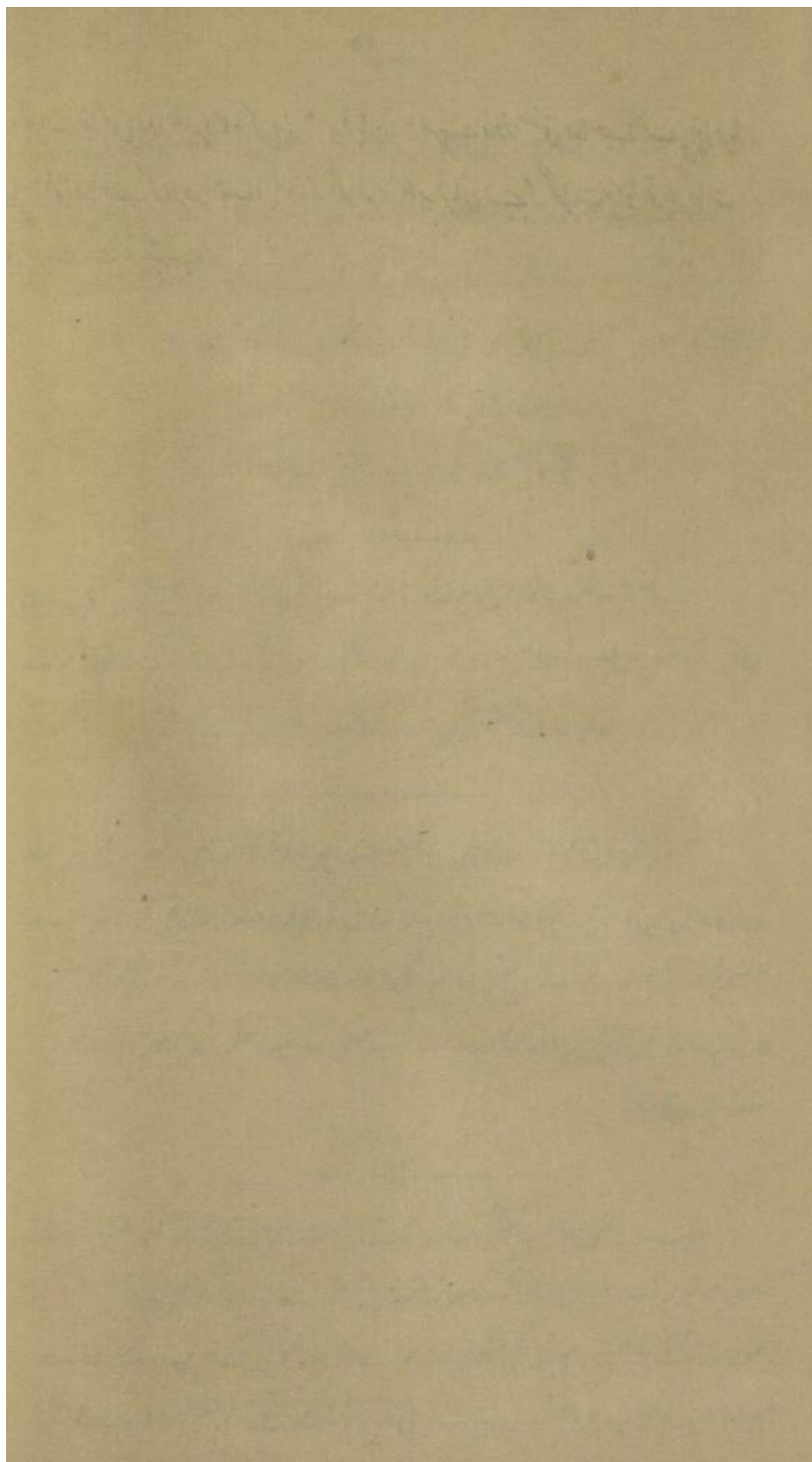
ضمیمہ

ہسپتال کی ڈائری

(مفتی صاحب — بارہ روز میو ہسپتال میں)
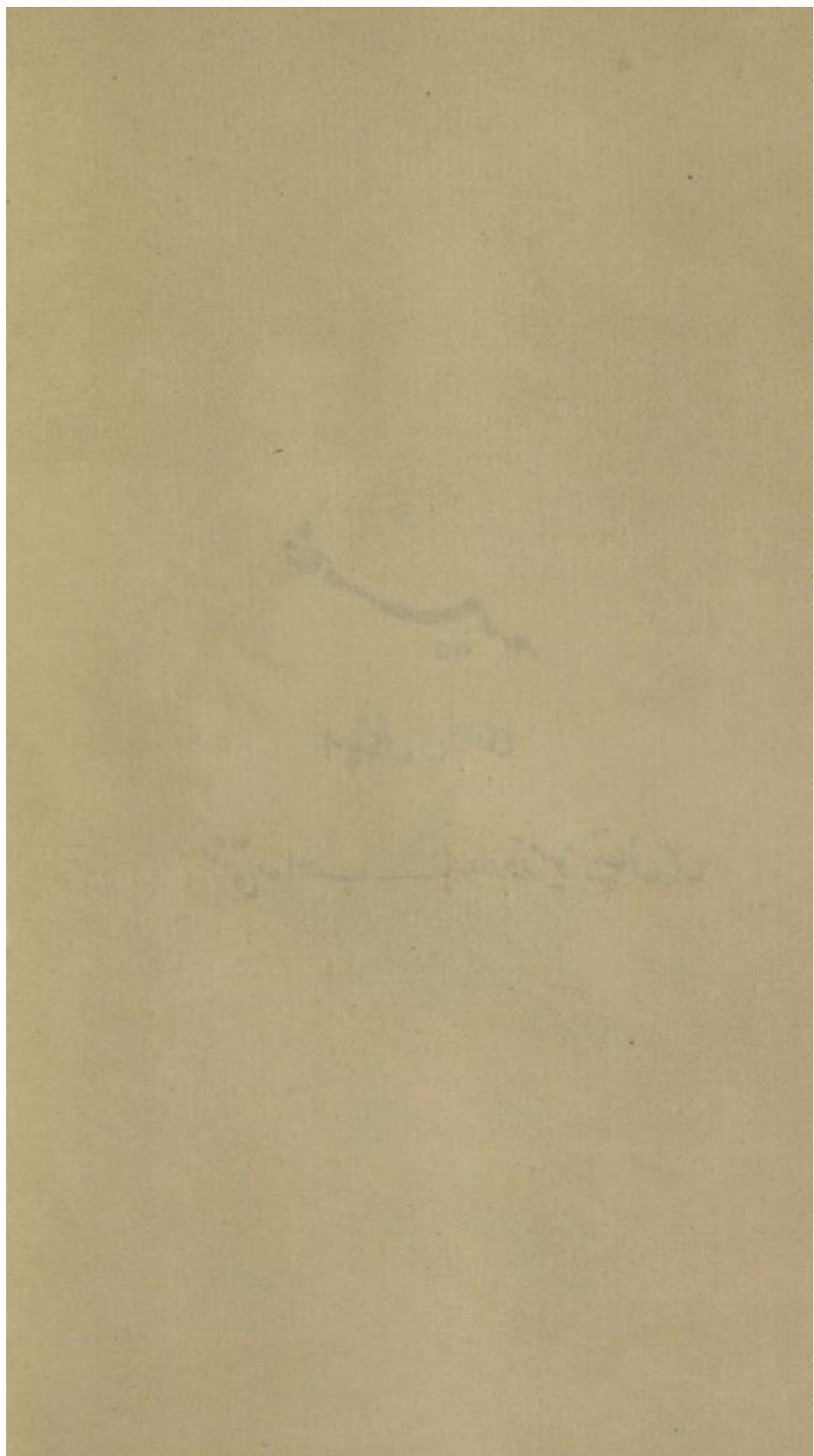
ہسپتال کی ڈائری

سوموار ۴۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء

آج مفتی صاحب قبلہ، میو ہسپتال میں داخل کرلئے گئے۔ آؤٹ ڈور سرجیکل وارڈ میں بیٹھے ہوئے حسب ذیل باتیں ہوتی رہیں۔

میں نے عرض کیا: اپنے والدِ ماجد مرحوم کے بارے میں کچھ بتایئے۔

ارشاد فرمایا:

"میرے والد کا نام محمد یار خاں[1] تھا۔ انہوں نے بچّوں کی تعلیم وتربیت کے لئے ایک مکتب قائم کر رکھا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ خدمت ہوجاتی، اسی پر قناعت کے ساتھ گزارہ کرتے۔ اپنے وطن اوجہانی (بدایوں) کی جامع مسجد میں امامت، خطابت اور مسجد کی نگرانی و انتظام کی خدمت بلا معاوضہ انجام دیتے تھے جس کا سلسلہ پینتالیس سال تک جاری رہا، اپنے ذاتی مکتب میں فارسی پڑھاتے تھے، بہت سے ہندو بھی ان کے شاگرد تھے۔

میرے والد کے ہاں پانچ لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں، لڑکا کوئی نہ تھا۔ انہوں نے منّت مانی اگر میرے گھر لڑکا پیدا ہوا تو اُسے خدمتِ دین کے لئے وقف کر دوں گا۔ چنانچہ میں پیدا ہوا اور مجھے علمِ دین کی تحصیل پر لگا دیا گیا میری پیدائش ۱۳۲۴ھ کے ماہِ شوال میں ہوئی تھی۔

---

[1] محمد یار خاں رحمہ اللہ کے قدرے مفصل حالات، کتاب کے آغاز پر "خاندانی پس منظر" کے زیرِ عنوان درج کئے گئے ہیں۔

"منظورِ حسین" میرا تاریخی نام ہے۔

(اس موقعہ پر مفتی صاحب کا ذہن ، راقم الحروف کے والد ماجد قاضی عبدالحکیم رحمۃ اللہ علیہ

ؔ میرے والد قاضی عبدالحکیم مرحوم ، ۱۹۰۰ء کے قریب ، گجرات کے ایک قریشی علوی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام مولا بخش اور دادا کا نام محمد علی تھا۔ ہمارے بزرگانِ خاندان ، مسلم فاتحین و سلاطین کے کسی دور میں حجاز سے ، برعظیم پاک و ہند میں آکر آباد ہوئے۔ خاندان کے بعض ارباب علم و فضل، غالباً مغلیہ عہد میں، منصبِ قضا پر فائز رہے۔ والدِ مرحوم ایک عرصے تک لاہور کی دینی درس گاہوں میں پڑھتے رہے۔ مشکوٰۃ اور جلالین تک اسباق پہنچے ہوئے تھے، کہ ہمارے دادا، حج پر گئے ہوئے تھے، وہیں انتقال کر گئے اور مکّہ مکرّمہ میں مدفون ہوئے۔ اب والدِ مرحوم کو گھر کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے گجرات واپس جانا پڑا۔ چنانچہ وُہ اپنے والد کی چھوڑی ہوئی کپڑے کی دُکان کو کامیابی کے ساتھ چلانے لگے مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد، کپڑے کے کاروبار کے بجائے، اس دکان پر، کتابوں کی خرید و فروخت ہونے لگی۔ والدِ مرحوم فرمایا کرتے : "ہمارا کپڑا کاغذ میں تبدیل ہوگیا" یہ تبدیلی ان کے علمی و دینی ذوق کے باعث رونما ہوئی تھی، چنانچہ انہوں نے بہت جلد اپنی دُکان کو، اسلامی لٹریچر اور عربی و فارسی کی کتابوں کے لئے، ضلع بھر کا واحد مرکز بنا ڈالا۔ علماء کو اچھی کتابیں، اہتمام کے ساتھ مہیا کرتے، مستحق طلبہ کو ان کی ضرورت کی کتب بلاقیمت دیتے۔ کاروباری زندگی میں آکر بھی، خدمتِ دینی کا ذوق و شوق بدستور قائم رہا۔ دکانداری کے دور میں، قرآن حکیم حفظ کرنے کا ولولہ پیدا ہوا، تو دن کے اوقات کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ صبح نمازِ فجر سے بارہ بجے دوپہر تک محلّے کی مسجد میں بیٹھ کر قرآن یاد کرتے اور اس کے بعد رات تک دکان پر بیٹھتے۔ یوں ایک سال میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ قرآن اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انھیں والہانہ محبت تھی۔ درود پاک اور روزانہ تلاوتِ قرآن، ان کے محبوب وظیفے تھے۔ ضلع گجرات کے علمائے اہلسنّت اور صلحاء کے ساتھ ان کی دوستی ہوتی تھی۔ پیر سیّد ولایت شاہ صاحب رحمہ اللہ، مولانا نیک عالم رحمہ اللہ (مراڑیاں۔ گجرات) اور مولانا محمد صالح رحمۃ اللہ (کالرہ دیوان سنگھ۔ گجرات) کے ساتھ، ان کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

کی یادوں کی طرف منتقل ہوگیا اور فرمانے لگے :)

آپ کو یاد ہوگا، کہ آپ کے والد قاضی صاحب مرحوم نے آپ کو ہمارے سپرد کیا تھا، پہلے آپ نے ہمارے گھر پر قرآن پاک ناظرہ پڑھا جب قرآن ختم کر لیا تو قاضی صاحب مرحوم نے اپنے مکان پر ہم سب اہل خانہ کی ایک پُر تکلف دعوت کی اور آمین کی محفل (مجلسِ ختم قرآن) بھی منعقد کی۔ اس موقعہ پر قاضی صاحب نے ایک مفصل تقریر کی، جس میں انہوں نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور اپنے ان جذبات کا اظہار کیا کہ مفتی صاحب نے جس طرح بچے کی قرآن خوانی خاص توجہ سے پایۂ تکمیل تک پہنچائی ہے۔ اسی طرح آئندہ علوم دینیہ کی تعلیم کے دوران بھی ان کی خصوصی عنایت و شفقت شاملِ حال رہے گی۔

آج ہی فرمایا :

اُس دور میں، میں کہا کرتا تھا گجرات میں اہل سنّت کے ستون تین شخص ہیں یعنی جن کے عقیدہ و مسلک پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے، پیر سیّد ولایت[1] شاہ صاحب قاضی عبدالحکیم صاحب

(بقیہ حاشیہ صفحہ)

گہرے مراسم تھے۔ مفتی صاحب گجرات میں تشریف لائے تو اہلِ خیر کی یہ بابرکت جماعت، ان کے لئے دست و بازو بن گئی۔ دارالعلوم خدام الصوفیہ گجرات کی رُوحِ رواں، تین چار شخص ہی تھے۔ ان میں ایک والدِ مرحوم بھی تھے۔ ان کی وفات ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ گجرات جی ٹی روڈ کے پاس اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہیں۔

[1] - قدوۃ السالکین حضرت پیر سیّد ولایت شاہ قدس سرہٗ رانیوال (گجرات) کے ترمذی سادات سے تھے۔ وُہ اپنی جوانی کی عمر میں گجرات شہر منتقل ہو گئے تھے، جہاں انہوں نے مسجد حاجی پیر بخش لاہوری مرحوم کی مسجد میں، قرآن حکیم کا مدرسہ قائم کیا جہاں ضلع بھر کے صدہا افراد قرآن حفظ کر کے نکلے۔ اس دور میں

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور تیسرے صاحب کا نام اب میرے ذہن میں نہیں آرہا۔ (دوسرے روز میں نے دوبارہ استفسار کیا اور کچھ نام یاد کرائے اور جب میں نے مولانا محمد عارف[ل] صاحب مدرس پبلک ہائی اسکول گجرات کا نام لیا تو فرمایا: ہاں، تیسرے صاحب یہی ہیں۔)

میں نے استفسار کیا: کہ گجرات آنے سے پہلے آپ کہاں کہاں تشریف فرما رہے۔

ارشاد فرمایا:

مراد آباد سے فارغ ہونے کے بعد دھوراجی (کاٹھیاوار) اور اس کے بعد کچھوچھہ شریف میں تدریس وغیرہ کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ہمارے محمد میاں کچھوچھہ شریف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱)

امیرِ ملت حضرت پیر جماعت علی شاہ علی پوری کے روحانی کمالات کا شہرہ عام تھا۔ سید ولایت شاہ صاحب، امیرِ ملت کے غائبانہ عقیدت مند بن چکے تھے بالآخر ایک بار جب حضرت امیرِ ملت، گجرات میں منشی عبدالکریم مرحوم و صوفی عبدالرحمٰن مرحوم (موخر الذکر راقم السطور کے نانا تھے) کے مکان پر قیام فرما ہوئے، تو سید ولایت شاہ صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سلسلۂ بیعت میں شامل ہو گئے اور جلد ہی ان کا شمار، امیرِ ملت کے اکابر خلفاء میں ہونے لگا۔ پیر سید ولایت شاہ کا وصال ۲۶۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ (۳۱۔ جولائی ۱۹۷۰ء) کو ہوا۔ انہیں گجرات کے محلہ علی پورہ میں دفن کیا گیا۔

ل مولانا محمد عارف صاحب، عرصہ دراز سے پبلک ہائی سکول گجرات میں ایک مدرس کی خاموش زندگی بسر کر رہے ہیں، مگر ان کی زندگی نہایت تعمیری ہے، انہوں نے صدہا بچوں کی سیرت و کردار پر، اپنی نیک دلی اور پارسائی کے اثرات ڈالے ہیں۔ اس کے علاوہ، انہوں نے مفتی صاحب مرحوم کے درس اور تقاریر قلم بند کرنے کا فریضہ سالہا سال تک ادا کیا۔ "مواعظ نعیمیہ" تو مکمل ان کے جمع کردہ مواعظ پر مشتمل ہے۔ اس کے آغاز میں ان کا تحریر کردہ پیش لفظ بھی موجود ہے۔

میں ۱۲۵۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ محمد مختار ابو جواد ان کا تاریخی نام ہے۔

آج ہی فرمایا:

"قرآن و سنت میں غور کرتے جاؤ تو ان کی اتھاہ گہرائیوں کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ اصحاب کہف کے مدتِ قیام کو قرآن پاک نے عجیب طریقے سے بیان فرمایا ہے:

وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝ — "اور وہ (اصحاب کہف) اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور انھوں نے نو زائد کئے۔"

(کہف: ۲۵)

اس میں "وَازْدَادُوْا تِسْعًا" کا فاعل اصحاب کہف نہیں ہیں بلکہ اہل عرب ہیں کہ انھوں نے اپنی قمری تقویم کی رُو سے تین سو پر نو کا اضافہ کیا ہے۔ قرآن پاک کی عبارت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ اصحابِ کہف غار میں پورے تین سو سال رہے اور اس کے بعد نو سال مزید رہے۔ اس بات کی کوئی تُک نہیں بنتی۔"

حدیث شریف سے ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا:

حدیث شریف میں آیا ہے:

صَلُّوْا كَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ۔[1] — تم لوگ اسی طرح نماز پڑھا کرو جیسے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔

یہاں "کما رایتمونی اُصلی" فرمایا ہے یعنی تمہاری نگاہیں میری نماز کو جیسا دیکھتی ہیں اُسی کی نقل تم اپنی نماز میں کر لیا کرو۔ "کَمَا اُصَلِّی" نہیں فرمایا۔ اگر یوں فرما دیا جاتا

---

[1] اس حدیث کو مشکوٰۃ المصابیح میں، مالک بن الحویرث کی روایت سے درج کیا گیا ہے، اور بتایا ہے کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے۔ دیکھئے مشکوٰۃ مطبوعہ اصح المطابع دہلی ص ۶۶۔

تو اس کا مطلب یہ نکلتا کہ جیسی نماز میری ہوتی ہے ویسی ہی نماز تم بھی پڑھو اور ظاہر ہے کہ حضورؐ کی نماز کی حقیقت اور اس کے مقام کو کون پا سکتا ہے اور ویسی نماز کون پڑھ سکتا ہے اس لئے " کَمَا رَأَیْتُمُوْنِی " فرما کر قابلِ عمل صورت پیدا کر دی۔ یعنی تمہاری ظاہری نگاہ میری نماز کی جس شکل و صورت کو دیکھتی ہے اُسی شکل و صورت کی پیروی تم بھی کر لیا کرو۔"

عرض کیا گیا: انتخابی مہم کے موقعہ پر بعض مذہبی رہنماؤں نے اپنی مذہبی روحانی قوت جتاتے ہوئے بڑے بڑے انتخابی دعوے کئے تھے بعض حضرات عالم رویا کی بشارتیں جلسوں میں سناتے رہے۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

"یہ سب کچھ نامناسب ہے۔ اہلِ دین کو دعوے اور پیش گوئی سے احتراز ہی کرنا بہتر ہوتا ہے۔ ہمارے دور کے ایک بڑے معروف بزرگ نے اپنے ایک عقیدت مند کے بارے میں فرما دیا تھا کہ " اگر یہ جہنم میں ڈال دیا گیا تو بھی میں اسے وہاں سے نکال کر اپنے ساتھ لے کر ہی جنت میں جاؤں گا " اب وہ بزرگ انتقال کر چکے ہیں اور ان کے وہ عقیدت مند صاحب عجیب و غریب باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بھائی! میں کہتا ہوں، کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بعض دعائیں پوری نہیں فرمائیں؛ مثلاً: حضورؐ کی دعا بئر معونہ سے متعلق اور اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کی دعا اپنی اُمت سے متعلق۔ ایسا کرنے میں حکمت یہی تھی کہ بندگی اور الوہیت کا فرق قائم رہے۔ بندہ آخر بندہ ہے۔"

۵۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء

آج ارشاد فرمایا:

کسی سفر میں مَیں اور مولانا عبدالغفور[1] ہزاروی مرحوم، واپسی پر گاڑی میں اکٹھے ہو گئے مولانا نے کچھ تامل کر کے مجھے پوچھا، مفتی صاحب کیا آپ مراد آباد اور میرٹھ میں مولانا مشتاق احمد مرحوم کانپوری کے پاس پڑھتے رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا: ہاں —!

تو بولے کیا مولانا کے پاس ایک ایسا طالب علم پڑھتا تھا جسے وہ اپنے انداز میں "غفورا" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ میں نے کہا: ہاں! مجھے یاد ہے کہ ہزارے کا ایک طالب علم لمبے لمبے بالوں والا تھا، جسے استاذِ مرحوم "غفورا" کہہ کر ہی بلایا کرتے (مفتی صاحب نے فرمایا کہ جب میں مولانا ہزاروی مرحوم سے یہ گفتگو کر رہا تھا اس وقت مجھے یہ قطعاً گمان نہ تھا کہ وہ طالب علم آج مولانا عبدالغفور ہزاروی بن کر میرے سامنے بیٹھا ہے کیونکہ اس دور میں ان کی شکل وصورت بھی کچھ اور ہی طرح کی تھی) یہ سن کر ہزاروی صاحب فرمانے لگے "مفتی صاحب، وہ "غفورا" میں ہوں!" اس کے بعد ہزاروی صاحب نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور فرمایا کہ "آپ میرے استاد بھائی ہیں۔"

مذکورہ گفتگو کے پس منظر کے طور پر ارشاد فرمایا: جس دور میں میں مراد آباد پہنچا اس وقت

---

[1] شیخ القرآن حضرت علامہ پیر محمد عبدالغفور ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ کا وصال، ۹۔ اکتوبر، ۱۹۷۰ء کو وزیر آباد جی ٹی روڈ پر ٹرک کے حادثے میں ہوا۔ ان پر "شیخ القرآن" کے نام سے ایک کتاب شائع ہو چکی ہے جو زیادہ تر حضرت علامہ مرحوم کے خطباتِ جمعہ پر مشتمل ہے۔ مگر شروع میں، کچھ حالاتِ زندگی بھی درج کئے گئے ہیں۔

میرے اسباق صدرا، شمس بازغہ، خیالی اور شرحِ چغمینی وغیرہ تھے۔ حضرت صدر الافاضل قدس سرہٗ نے محض میرے ان اسباق کے لئے کانپور سے مولانا مشتاق احمد مرحوم کو بلوا لیا۔ اُس دور میں ان کا مشاہرہ ۸۰ روپے مقرر ہوا اور ان کے ساتھ آنے والے چند طلبائ کے جملہ اخراجات بھی حضرت نے برداشت کئے۔ انہی طلباء میں مولانا عبدالغفور ہزاروی بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالحق بہاری اور مولانا عتیق الرحمٰن بستی (یوپی) کے نام بھی یاد آتے ہیں۔ چند ماہ کے بعد استادِ گرامی مولانا مشتاق احمد میرٹھ چلے گئے اور مجھے بھی ساتھ روانہ کر دیا گیا۔ میرٹھ میں بھی مولانا عبدالغفور ہمارے ساتھ پڑھتے رہے۔ استاذِ گرامی مولانا مشتاق احمد کانپوری مرحوم و مغفور فنون اور معقولات (منطق، فلسفہ، ریاضیات) کے اپنے وقت کے بہت بڑے ماہر مدرس تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا نثار احمد کانپوری کا شمار ملک کے نامور خطیبوں میں ہوتا تھا اور انہیں بلبلِ ہند کہہ کر بھی پکارا جاتا، مولانا مشتاق احمد کچھ عرصے کے لئے حجاز مقدس میں بھی تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ چنانچہ جب میں حج کے لئے گیا تو بعض عرب علماء نے مجھے بتایا کہ وہ مرحوم مولانا مشتاق احمد کانپوری کے تلامذہ میں ہیں۔

آج ہی اپنے ایک مناظرے کی کیفیت سنائی، فرمایا: دادوالی ضلع گجرات میں میرے اور مولوی احمد دین صاحب گکھڑوی کے درمیان حاضر و ناظر کے مسئلے پر مناظرہ ہوا۔ اس مجلس مناظرہ کی صدارت حضرت مولانا عبدالغفور ہزاروی فرما رہے تھے۔ گفتگو شروع ہوئی تو مقابل نے ذرا بے باکی کے انداز میں کہا: "کیا حضورؐ کو دوزخ میں بھی حاضر و ناظر مانو گے" (استغفر اللہ!) ہزاروی صاحب حمیتِ دینی کے جذبہ و جلال کے ساتھ اجتماع کی طرف متوجہ ہو کر بولے: "مسلمانو! دیکھو یہ مولوی حضورؐ کے بارے میں کیا کہہ رہا ہے" بس یہ کہنا تھا کہ سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور مولوی صاحب پر پل پڑے۔ اب تو

مولوی صاحب یہ کہتے ہوئے بھی سُنے گئے "غوثِ پاک کے لئے مجھے چھوڑ دو۔"

ایک اور روئداد سناتے ہوئے فرمایا:

کھوڑ (پنڈی گھیب) میں میرے اور غلام اللہ صاحب کے درمیان ایک مباحثہ ہوا یعنی فریقین نے اپنے اپنے وقت میں تقریریں کیں جن میں اپنے اپنے دلائل پیش کئے گئے بعد میں گلیانہ (کھاریاں) کے مقام پر دعا بعد جنازہ کے مسئلے پر غلام اللہ خاں صاحب نے میرے ساتھ مناظرہ کیا۔ جب میں نے یہ حدیث پیش کی:

اِذَا صَلَّیْتُمْ عَلَی الْمَیِّتِ فَاَخْلِصُوْا لَہُ الدُّعَاءَ۔[1]

(جب تم میّت کی نماز جنازہ پڑھو، تو اس کے لئے اخلاص کے ساتھ دُعا کرو۔)

تو مولوی صاحب موصوف کہنے لگے کہ مُغنی اللبیب میں یہ قاعدہ موجود ہے کہ جب فا کا ماقبل افعالِ جوارح میں سے ہو تو وہ فا تعقیب کے لئے نہیں ہوگی بلکہ اس کے مابعد کا حکم ماقبل میں داخل ہوگا۔ لہٰذا روایت کا مفہوم یہ ہُوا کہ جب تم میت پر نماز جنازہ پڑھ رہے ہو تو نماز کی حالت میں اس کے لئے مخلصانہ دُعا کرو۔ میں نے اس پر کہا یہ قاعدہ مجھے تو منظور ہے مگر قرآنِ حکیم اس قاعدے کو تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن میں ہے:

فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا۔ "پس جب کھانا کھاؤ، تو رخصت ہو جاؤ۔"

(احزاب: ۵۳)

دیکھئے یہاں فا کا ماقبل افعالِ جوارح میں سے ہے۔ اب اگر آپ کا قاعدہ درست ہو تو آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ جب تم کھانا کھا رہے، ایک ہاتھ میں لقمہ ہو اور دوسرے ہاتھ میں شوربے کا پیالہ تو بس اسی حالت میں اٹھ کر بھاگ نکلو۔ اس پر مولوی صاحب کو خاموشی کے

---

[1] اس حدیث کو صاحبِ مشکوٰۃ نے حضرت ابوہریرۃ کی روایت سے نقل کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ حدیث ابوداؤد اور ابن ماجہ میں موجود ہے۔ دیکھئے مشکوٰۃ (کتاب الجنائز) ص ۱۴۶۔

سوا چارہ نظر نہ آیا اور مناظرہ ختم ہوگیا۔

موخر الذکر واقعہ سے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جب میں پنڈی گھیپ جانے کے لئے گجرات ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو حافظ محمد یوسف[1] صاحب نے مجھے ایک نوٹ بک[2] دی اور کہا کہ شاید یہ آپ کو کچھ مدد دے۔ چنانچہ میں اسے سفر میں دیکھتا رہا۔ اس نوٹ بک میں متعدد مسائل اختلافیہ کے عنوانات کے ماتحت، دلائل اور حوالہ جات کی نشان دہی کی گئی تھی۔ اس سے میرے اس موضوع پر کام کرنے کے دیرینہ ارادے[3] کے لئے تازہ داعیہ پیدا ہوا

---

[1] حکیم محمد یوسف صاحب، گجرات شہر کے اہل علم اور متدین اصحاب میں سے ہیں۔ خود صاحبِ علم و فضل ہونے کے ساتھ وہ علماء صلحاء کے بڑے قدر دان اور معاون بھی رہے ہیں۔ آج سے پندرہ بیس برس پیشتر تک، گجرات میں اہل سنّت کے مخیر حضرات اور اصحابِ علم حضرات کے باہمی ربط و تعاون سے، جو تنظیم معرضِ وجود میں آگئی تھی، حافظ صاحب اس کے ایک ممتاز رکن تھے۔ گزشتہ سولہ سترہ برس سے وہ لاہور میں قیام پذیر ہیں۔ آجکل گلبرگ میں اپنا مطب کرتے ہیں۔

[2] تقریباً اسی نوعیت کی ایک نوٹ بک، مولانا حافظ بشیر احمد صاحب خطیب حافظ آباد نے بھی مرتب کرنی شروع کی تھی۔ مگر غالباً وہ ابھی دو تین عنوانات سے زیادہ پر کام نہ کر سکے تھے، بہر نوع، ان کے اپنے بیان کے مطابق، انہوں نے بھی حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو اپنی یہ نوٹ بک ملاحظہ کرائی تھی۔ اور مفتی صاحب نے اسے بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ مولانا حافظ بشیر احمد صاحب، دورِ گجرات میں مفتی صاحب کی پہلی جماعتِ دورۂ حدیث کے شریک طلبہ میں ہیں۔ انہوں نے درس نظامی کی تعلیم، اس سے قبل، پنجاب کی جید دینی درس گاہوں میں پائی تھی۔ فراغت کے بعد ایک مدّت تک وہ سانگلہ ہل میں خطیب رہے اور اب ایک عرصے سے حافظ آباد میں خطابت اور تبلیغی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

[3] مجھ سے مفتی صاحب قدس سرہٗ نے ایک بار فرمایا: "جاء الحق" سے بہت پہلے، اسی موضوع پر میں نے ایک رسالہ تحریر کیا تھا، اور اس کا مسودہ، حضرت صدر الافاضل قدس سرہٗ کے ملاحظے کے لئے مراد آباد بھجوا دیا تھا۔ سوءِ اتفاق سے وہ مسودہ وہاں کہیں گم ہوگیا اس لئے مذکورہ رسالہ طبع نہ کرایا جا سکا۔

اور میں نے اس سفر سے واپس آکر مذکورہ موضوع پر کام شروع کر دیا۔ مستند حوالہ جات اور مفصل دلائل جمع کر کے، تمام مباحث تحریر کئے۔ یہی محنت "جاء الحق" کی شکل میں منظر عام پر آئی۔ الحمد للہ! یہ کتاب بہت مقبول ہوئی ہے۔ تقریباً ایک لاکھ سے زائد چھپ چکی ہے۔

آج ہی حضرت میاں صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ بھی ہوا۔ میں نے عرض کیا:

"گجرات کے حاجی سلطان علی صاحب نے مجھے یہ واقعہ خود سنایا تھا کہ حاجی صاحب اپنے ایک دوست کے ہمراہ شرقپور پہنچے۔ جب مسجد میں نماز ظہر سے فارغ ہو کر میاں صاحب نے مہمانوں کے کھانے کا انتظام شروع کیا تو ہمارے دل میں خیال آیا کہ آج میاں صاحب کے ہاں ہمیں ایسا کھانا ملنا چاہئے جو پہلے کبھی نہ کھایا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک برتن میں کھیر لائی گئی میاں صاحب نے وُہ کھیر ہمارے سامنے رکھوادی۔ جب ہم کھا چکے تو فرمایا کہ یہ کھیر تم نے پہلے کبھی نہیں کھائی۔ یہ چاول گنّے کے رس اور اونٹنی کے دودھ میں پکے ہوئے تھے۔ اس پر ہم دونوں حیران رہ گئے۔"

مجھ سے یہ واقعہ سننے کے بعد مفتی صاحب قبلہ دیر تک حضرت میاں صاحب کے کمالات کی تعریف و توصیف کرتے رہے اور فرمایا:

"میں نے میاں صاحب کے مزار پر حاضری دی ہے، جس دکان میں سودا ہوتا ہے گاہک وہیں آتا ہے۔"

مفتی صاحب قبلہ کی کلائی والی گھڑی میں لوہے کی زنجیر لگی ہوئی تھی، فرمانے لگے:

"تمہارا کیا خیال ہے یہ حرام تو نہیں" عرض کیا گیا: "جب آپ نے پہنی ہے تو پھر یہ کیسے حرام ہو سکتی ہے۔" فرمایا: "بعض لوگوں کو اس کی حرمت پر اصرار ہے اور" احکامِ شریعت"

کی عبارت کو بنیاد بناتے ہیں حالانکہ احکامِ شریعت اعلیٰحضرت کی اپنے قلم سے تصنیف کردہ کتاب نہیں البتہ ان کے مسائل کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ جس میں بعض مقامات محلِ غور بھی ہیں۔ اس لئے ہر کتاب پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ اہلِ علم کو چاہئے کہ براہِ راست بھی تحقیق کر لیا کریں۔ اس مسئلے کی مفصل بحث اعلیٰحضرت کے رسالے الطیب الوجیز فی امتعۃ الورق والابریز میں موجود ہے؛

عرض کیا گیا، البانیؒ نے مشکوٰۃ المصابیح کا ایک نسخہ ترتیب دیا ہے، جو حال ہی میں دمشق سے شائع ہوا ہے۔ اس میں تخریج احادیث، صحت یا عدمِ صحت، نیز حوالہ جات کی تصدیق و تصحیح پر بڑی محنت سے، تحقیقی کام کیا گیا ہے۔ اس کام کی بہت تحسین و تعریف فرماتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ارشاد فرمایا؛

"امام اعظم سے متاخر محدثین، جن احادیث کو ضعیف کہتے ہیں، وہ دراصل ضعیف نہیں ہوتیں۔ محدثین صرف سند کے ضعف سے بحث کرتے ہیں اور یہ ضعف سند کے نچلے حصے (سافل) میں واقع ہوتا ہے، نہ کہ اُس اُوپر والے (عالی) حصے میں، جس کا تعلق امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ہے۔"

آج کے فرمودات میں یہ بات، بہت زور دے کر ارشاد فرمائی:

"نہایت افسوس ہے، آج کل زمین کے اُوپر قبریں بنانے کا رواج چل نکلا ہے۔ چنانچہ ماضی قریب میں ہمارے ہاں، چند بزرگانِ دین کے مزارات اسی طرح بنائے گئے ہیں کہ تھوڑی سی زمین کھود کر صندوق اس میں ٹھہرایا، اور چاروں طرف سے دیوار کھڑی کر دی گئی۔

لہ الشیخ محمد ناصر الدین البانی کی تحقیق و تنقیح کے ساتھ، مشکوٰۃ المصابیح کو، المکتب الاسلامی دمشق نے تین مجلدات میں شائع کیا ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۱ء) میں طبع ہوا۔

زمین کی گہرائی میں پوری قبریں نہیں کھودی گئیں۔ یہ سارا عمل خلافِ سنّت ہے۔ اسی طرح صندوق میں میّت کو بند کرنا بھی، مسلمانوں کے معروف طریقے کے خلاف ہے۔ میں نے پچھلے دنوں ایک جگہ تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"پہلے تو جیتے جی کے رسم و رواج پر انگریزی طریقے مسلّط ہوئے تھے، اب موت کے بعد بھی عیسائیت ہم پر غالب آنے لگی ہے، زمین سے اُوپر قبریں بنانا، اور میّت کو صندوق میں دفن کرنا، یہ سب اغیار کے طریقے ہیں۔ وہ جو احادیث میں آیا ہے کہ حضورؐ نے اونچی قبریں گرا دینے کا حکم دیا تھا، وہ یہی نصاریٰ کی قبریں تھیں، جو زمین سے اُوپر کھڑی کی جاتی تھیں۔"

آج ہی کی مجلس میں فرمایا:

"آپ کی کتاب "مقالات یوم رضا حصہ سوم" میں نے پڑھی ہے، بہت سی اہم اور نئی معلومات اس میں آگئی ہیں۔ پھر بطورِ مثال ایک دو باتوں کا خصوصی ذکر کیا۔ بعدازاں فرمایا:

"ہمارے ہاں اوّل تو کتابیں لکھی کم جاتی ہیں، اور اگر لکھی جاتی ہیں تو چھاپی نہیں جاتیں، اور اگر چھاپی جاتی ہیں تو پڑھی نہیں جاتیں۔"

اس موقع پر عرض کیا گیا "جاہل اور طالع آزما مقرّروں اور واعظوں نے قوم کا مذاق بگاڑ دیا ہے۔ اب ہمارے ہاں علمی نکات تو درکنار، سیدھے سادھے الفاظ میں آیت یا حدیث کا مفہوم بیان کیا جائے تو اس کی پذیرائی نہیں ہوتی۔ روایت و حکایت اور شعر و لطیفہ کی لت پڑ چکی ہے۔"

اِن معروضات سے مکمل طور پر اتفاق فرمایا اور اپنے وہ اشعار پڑھ کر سنائے،

جن میں یہی مضمون بیان فرمایا ہے۔ ایک مصرعہ یہ ہے:

ع   مالِ سُنی بہرِ قوالی و عُرس

یہ اشعار آپ کے مطبوعہ[1] دیوان کے آخر میں موجود ہیں۔

اس کے بعد اسی انداز کے ایک مُقرر کی کچھ باتیں سُنانے لگے۔ فرمایا:

فلاں مقرر صاحب ایک تقریر میں کہہ گئے: "یا اللہ میں تیرا شریک ہوں، تُو بھی کملی والے کو چاہنے والا اور میں بھی اُسے چاہنے والا" اور معراج کی تقریر میں "قاب قوسین" کا مقام یوں بیان فرمایا۔ "رب کہتا تھا" اُوپر میرے پاس آجاؤ"، کملی والا کہتا تھا" تھوڑا سا تُو نیچے اُتر آ۔" آخر رب کو ہی ماننا پڑا۔ (العیاذُ باللہ!)

فرمایا یہ سب کفر ہے۔ جنہوں نے یہ سُن کر نعرے لگائے، انہوں نے بھی ارتکابِ کفر کیا۔ کیونکہ وُہ کفر پر راضی ہوئے۔

آج ہی کی گفتگو میں، میں نے ایک بزرگ رسول شاہ صاحب کا تذکرہ کیا کہ وُہ کئی برسوں سے حضرت داتا گنج بخش قدس سرہٗ کے مزار اور مسجد میں رہتے ہیں۔ شب و روز وہیں گزارتے ہیں، قضائے حاجت کے علاوہ باہر کبھی نہیں جاتے۔ ایک دو بار سخت بخار کی حالت میں، انہیں ساتھ والے کسی مکان میں منتقل کر دیا گیا مگر جب ہوش آیا تو دربار واپس لے جانے پر اصرار کیا۔ میں نے مزید عرض کیا، کہ یہ شاہ صاحب، حضرت سائیں گو ہر دین جینڈھڑ والوں کے بہت قریب رہے ہیں۔

میری یہ گفتگو پوری توجّہ اور انہماک سے سُنتے رہے۔ بعد میں فرمایا:

"میں ان شاہ صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہُوں، مگر اب یہ کام آپ کے

---

[1] مفتی احمد یار خاں، دیوان سالک (مطبوعہ نعیمی کتبخانہ گجرات) آخری صفحہ

وقت ہے۔ میں ہسپتال سے فارغ ہو جاؤں، تو آپ اس کا بندوبست
کریں گے۔"

عرض کیا گیا: "انشاء اللہ العزیز!" (مگر افسوس کہ اس ملاقات کا موقع نہ بن سکا)

بدھ وار ۶۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء

آج دوپہر سے پہلے ہسپتال میں حاضر ہوا تو حسب ذیل باتیں ارشاد فرمائیں:

"بھائی تم میری باتیں شاید لکھ رہے ہو۔ تو دیکھو علامہ ہزاروی مرحوم کے واقعے میں وُہ لفظ "غفورا" نہ لکھنا۔ اچھا نہیں لگتا، وہ ہماری جماعت میں بڑے محترم عالمِ دین تھے۔

عرض کیا گیا:

"وہ تو ایک واقعے کی حکایت ہے اور یہ لفظ ان کے اُستادِ گرامی استعمال فرماتے تھے۔ اب اسے بدلا جائے تو خلافِ واقعہ ہوگا۔"

ذرا تأمل کیا اور میری اس بات سے اتفاق فرمایا کہ ان کے استادِ گرامی، یہ لفظ پیار کے ساتھ بولتے تھے۔ ارشاد ہُوا:

"اچھا تو پھر یوں کہا جائے کہ علامہ ہزاروی کے استادِ گرامی انہیں پیار کے انداز میں "غفورا" کہہ کر پکارتے تھے۔"

(یہ سب کچھ سُنتا رہا اور سوچتا رہا کہ علمائے حق، اپنے ہمعصر علماء کے احترام کے تقاضوں کو کہاں تک ملحوظ رکھتے ہیں۔)

آج اسی مجلس میں، میں نے اپنے ایک دُوسرے گرامی مرتبت استاذ قاضی عبدالسبحان[۱]

---

[۱] میں نے گجرات ہی میں، حضرت علامہ قاضی عبدالسبحان ہزاروی مرحوم و مغفور سے، دو سال سے کچھ زائد عرصہ تک، معقولات کی آخری کتابیں پڑھیں، یہ وہ دور تھا جب کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم، انجمن خدام الصوفیہ (باقی ص ۱۱۴ پر)

ہزاروی (کھلابٹ) رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ فرمایا:

"میں نے ان کی عظمت کا اندازہ، ان کی متواضع طبیعت اور اخلاقِ کریمانہ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۳)

کے دارالعلوم سے الگ ہو گئے، تو قاضی صاحب کو اس دارالعلوم میں صدر مدرس کی حیثیت سے لایا گیا تھا۔ قاضی صاحب بہت بڑے جید عالم، اپنے وقت میں معقولات اور فنِ مناظرہ کے امام اور بلند مرتبت صوفی بزرگ تھے۔ ہمارے اس دور میں ان کا وجود ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔

قاضی صاحب قدس سرہٗ ۱۸۹۸ء میں کھلابٹ (ہری پور ہزارہ) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے برِعظیم کے چوٹی کے فضلائے روزگار سے علم حاصل کیا، جن میں استاذ العلما حضرت علامہ قطب الدین غورغشتوی (کیمبل پور) اور علامہ حکیم برکات احمد صاحب ٹونکی کے اسماءِ گرامی ممتاز ہیں۔ علامہ غورغشتوی کو جب ہندوستان کی ریاست مینڈھو میں تدریس کے لئے بُلایا گیا، تو وہ اپنے عزیز تلمیذ قاضی صاحب کو اپنے ساتھ لیتے گئے اور علامہ ٹونکی سے پڑھنے کے لئے قاضی صاحب، ریاست ٹونک میں پہنچے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد، قاضی صاحب نے عمر بھر، تدریس کی خدمات انجام دیں۔ گجرات میں پہلی بار ۱۹۳۶ء میں مدرسہ بیگم پورہ میں ایک سال اور دوسری بار ۱۹۵۰ء کے آس پاس، گجرات دارالعلوم خدام الصوفیہ میں تقریباً تین برس قیام فرما رہے۔ اس کے بعد شرق پور، راولپنڈی احسن المدارس، اور ہری پور ہزارہ مدرسہ رحمانیہ میں بھی بحیثیت صدر مدرس کام کیا۔ آخری ایام اپنے گاؤں میں گزارے۔ جہاں ۱۲۔ شوال ۱۳۷۷ھ (مطابق ۲۰۔ مئی ۱۹۵۸ء) کو انتقال فرمایا۔ مزارِ مبارک کھلابٹ میں ہے۔ میں نے اس سال اگست کے آخر میں، مزار پر حاضر ہو کر فاتحہ خوانی کی۔

آپ کی تالیفات میں، "مواہبُ الرحمٰن" اور "انوار الاتقیاء فی حیاۃ الانبیاء" طبع ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں، بخاری، مشکوٰۃ، معانی الآثار، بیضاوی اور دیگر متعدد کتبِ درسِ نظامی پر آپ نے شروح و حواشی تحریر فرمائے، جو زیادہ تر عربی میں ہیں، اور ہر کتاب کے ذاتی نسخے پر، اپنے قلم سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

کیا۔جب مدرسہ رحمانیہ ہری پور (ہزارہ) میں تشریف فرما تھے تو مجھے انتہائی اصرار کر کے، وہاں ایک جلسے میں مدعو کیا۔ بس پھر کچھ نہ پوچھئے۔ جتنا وقت میں نے گزارا، قاضی صاحب مرحوم تواضع کی سراپا تصویر بنے رہے۔ میں نے دوسری مثال ایسی نہیں دیکھی، کہ وقت کا اتنا بڑا عالم، دوسرے عالم کی اس قدر توقیر کرے، جیسی قاضی صاحب مرحوم و مغفور فرماتے رہے۔ واپسی پر تانگے میں سوار ہونے لگا، میرے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی، اس لئے ذرا رکاوٹ پیدا ہوئی تو مرحوم لپک کر آگے بڑھے اور اپنے ہاتھوں سے میرے پاؤں کو تھام لیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے کہا: "حضرت یہ آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں، یہاں بیسیوں طالب علم آپ کے خدام کھڑے ہیں۔ مجھے وہ سہارا دے سکتے ہیں۔"

فرمایا: "مہمان آپ میرے ہیں، اس لئے آپ کی ہر خدمت مجھی پر لازم ہے۔"

اس کے ساتھ ہی قاضی صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولانا قاضی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۴)

تحریر کردہ ہیں۔ ہماری طالب علمی کے دور میں، معانی الآثار للطحاوی پڑھاتے ہوئے، میرے محترم رفیق سبق، صاحبزادہ محمد مسعود الحسن کے نسخۂ طحاوی پر، عربی میں ایک مختصر حاشیہ تحریر فرماتے رہے جس کی نقل صاحبزادہ صاحب نے میرے نسخے پر بھی اتار دی۔ غالباً یہ حاشیہ آپ کی "شرح طحاوی" سے الگ تالیف ہے۔ آپ نے اپنے پیچھے دو صاحبزادے چھوڑے، بڑے صاحبزادے مولانا قاضی غلام محمود صاحب ہزاروی جہلم میں مقیم ہیں اور چھوٹے مولانا مفتی سیف الرحمٰن صاحب ہزاروی، اپنے گاؤں میں تدریس اور دیگر دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حضرت قاضی صاحب قدس سرہٗ کے مزید احوال و آثار کے لئے دیکھئے کتاب: "فیوضات سبحانیہ" (معروف بہ "مناظرے") مطبوعہ کتب خانہ غوثیہ عمریہ جادہ، جہلم۔

غلام محمود صاحب[1] کا تذکرہ بھی تعریف و توصیف کے ساتھ کیا۔ فرمایا:

"میرے ساتھ حج کے موقع پر جمع ہو گئے تھے، میں نے انہیں مسجد نبوی میں اکثر رقت کی حالت میں دیکھا۔"

آج کی گفتگو میں بتایا:

"گوجرانوالہ کے کسی اہل حدیث صاحب نے پچھلے دنوں میرے ساتھ رکعاتِ تراویح کے مسئلہ پر خط و کتابت کی ہے۔ انہوں نے وہی احادیث نقل کر کے بھیجیں، جن میں آٹھ رکعت رات کی نماز کا ذکر آیا ہے۔ میں نے اس کے جواب میں انہیں ایک اصولی بات لکھی کہ جو احادیث آپ پیش کرتے ہیں ان سب میں "قیامُ اللیل" (رات کی نماز) کا ذکر ہے اور اس سے تہجد کی نماز مراد ہے، نہ کہ تراویح۔ اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں یہ آیا ہے کہ رمضان یا غیر رمضان میں آپ نے رات کی نماز تیرہ رکعت سے زائد نہیں پڑھی۔ ظاہر ہے کہ اس سے وہ نماز مراد ہے جو رمضان اور غیر رمضان دونوں میں پڑھی جاتی ہے۔ اسی لئے محدثین کرام نے ان احادیث کو "صلوٰۃ اللیل" یا "قیامُ اللیل" کے باب میں درج کیا ہے۔ باقی رہی نمازِ تراویح، تو اسے احادیث میں "قیام شہر رمضان" (ماہ رمضان کی نماز) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ محدثین نے

---

[1] مولانا قاضی غلام محمود صاحب کا مجمل ذکر، پیچھے، اُن کے والدِ گرامی حضرت قاضی صاحب قدس سرہٗ کے تذکرے میں (صفحہ ١١٥ پر) گزرا ہے۔ قاضی صاحب نے انہیں بڑے پیار اور محنت کے ساتھ علم دین پڑھایا تھا، اور شروع ہی سے انہیں "مولوی" کہہ کر پکارا کرتے، جیسے چھوٹے صاحبزادے کو "مفتی"، کا لقب دے رکھا تھا۔ قاضی غلام محمود صاحب نے حضرت استاذ العلماء سے مثنوی بھی پڑھا تھا۔ قاضی صاحب موصوف، پچھلے کئی برسوں سے جامع مسجد عیدگاہ جہلم میں، خطابت، تدریس اور تصنیف و تالیف کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ "فیوضاتِ سبحانیہ" زیادہ تر آپ کی ہی مرتبہ تالیف ہے۔

"قیام شہر رمضان" کا باب علیحدہ باندھا ہے۔ اس لئے آپ لوگ بنیادی غلطی یہ کرتے ہیں کہ "صلوٰۃ اللیل" (رات کی نماز ـ تہجد) کی احادیث کو نمازِ تراویح کے مسائل کے لئے پیش کرتے ہیں۔ "صلوٰۃ اللیل" والی احادیث کو چھوڑ کر، تراویح کے بارے میں آپ ایک حدیث ایسی پیش کریں، جس میں تعداد رکعات آٹھ بیان کی گئی ہو۔"

فرمانے لگے: "چند خطوط کے بعد اُن صاحب نے تحریر میں تلخ کلامی شروع کر دی اور آخر میں خط و کتابت کا سلسلہ ختم کر دیا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد مجھے ملنے کے لئے گجرات آ گئے۔ بیٹھک میں جہاں میں سبق پڑھاتا ہوں آ کر بیٹھ گئے۔ میں تو پہچانتا نہ تھا۔ خود ہی تعارف کرایا۔ میں نے دل میں سوچا "مخالف میرے گھر چل کر آ گیا ہے، اب اس کے ساتھ خلقِ محمدیؐ کے مطابق، کریمانہ برتاؤ ہونا چاہئے۔ چنانچہ میں نے فوراً چائے تیار کرائی اور ساتھ عمدہ قسم کی مٹھائی منگوا کر رکھی۔ اور باصرار کھلایا پلایا۔ جب وہ صاحب اٹھے، تو میں چند قدم ساتھ چلا گیا۔ کہنے لگے "یہ آپ کیا کرتے ہیں؟" میں نے کہا "یہ میں حدیث اور سنّت کے مطابق مشایعت کر رہا ہوں، آپ اہل حدیث ہو کر مجھے عمل بالحدیث سے روکتے ہیں۔" جاتی دفعہ بولے۔ ہم یہ سمجھتے تھے، "حنفیوں میں حدیث کسی کو نہیں آتی۔ مگر آپ اس سے مستثنیٰ نکلے۔" میں نے جواب میں کہا "صاحب یہ بات نہیں، بلکہ دراصل حدیث حنفیوں ہی کو آتی ہے۔"

اسی موقع پر، میں نے اپنی کتاب "تحقیقِ قربانی" کے بارے میں عرض کیا:
اس کتاب کے شائع ہونے سے چند دن بعد، چوک شاہ عالم میں مجھے ایک اہل حدیث صاحب نے روک لیا اور استفسار کیا "کیا کوکب صاحب آپ ہیں؟"
میں نے جواب دیا: "ہاں"۔ تو وہ صاحب کہنے لگے "کئی بار آپ سے ملنے کے لئے گیا مگر آپ نہ ملے، جی چاہتا ہے اس ہاتھ کو چوما جائے جس سے تحقیق قربانی

لکھی گئی ہے۔ مفتی صاحب قبلہ یہ بات سُن کر متعجب اور بہت مسرور ہوئے۔ فرمانے لگے :۔

"کہ میں اب اس کتاب کو بالاستیعاب پڑھنا چاہتا ہوں پہلے میں نے جستہ جستہ نظر ڈالی تھی۔"

عرض کیا :

"انشاء اللہ کتاب کا نسخہ جلد پیشِ خدمت کیا جائے گا۔"

آج ہی کی نشست میں فرمایا :

"میں اعلیٰ حضرت کے ایک رسالے "عطایا القدیر فی احکام التصویر" سے بہت متاثر اور مستفید ہوا۔ یہ رسالہ مجھے صدر الافاضل مرحوم نے عطا کیا۔ چونکہ میری طالب علمی دیو بندی مکتبِ فکر کے اساتذہ سے متاثر تھی اس لئے میرے ذہن میں یہی بات بیٹھی ہوئی تھی کہ علمی تحقیق صرف علمائے دیو بند کی تالیفات میں ہی ملتی ہے۔ جب میں نے مذکورہ رسالے کا مطالعہ کیا تو میں اس کے لکھنے والے کے تبحرِ علمی اور دقتِ نظر کے کمال کا گرویدہ ہو گیا۔ سچ یہ ہے کہ اس ایک رسالے نے میری ذہنی اور اعتقادی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔"

اِن ہی باتوں کے درمیان کسی طرح میری کتاب مقالاتِ یوم رضا کا ذکر بھی آ گیا ، میں نے عرض کیا کہ اپنے ایک ہم مسلک دوست کو اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ میرے ایک مضمون میں اعلیٰ حضرت اور علامہ اقبال کے درمیان ایک موازنہ سا پیش کیا گیا ہے ، ان صاحب کا خیال یہ تھا کہ ایسا کرنا اعلحضرت کے حق میں سوءِ ادبی ہے ۔

فرمانے لگے ، "کیا کیا جائے سمجھ میں نہیں آتا ہمارے دوستوں کو کیا ہو گیا ہے ۔"

قاضی صاحب میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنا کام کرتے رہیں اور ایسی بے جا مخالفتوں کی پروا نہ کیا کریں۔ ہمارے کرم فرماؤں کی مخالفتوں کا کیا کہنا میری مخالفت گھڑی کی زنجیر پر ہونے لگی تھی کہ لوہے کی زنجیر استعمال کرنا ممنوع ہے۔ میں نے کہا: "اگر ممنوع ہے تو ممانعت کی کوئی دلیل پیش کرو، دلیل پیش نہیں کی گئی۔"

بعد دوپہر کی ملاقات میں "شاہِ جیلاں" اور مقالات یوم رضا حصّہ اول کے نسخے پیش کئے، "شاہِ جیلاں" میں درج میری لکھی ہوئی منقبت ملاحظہ فرمائی اور حوصلہ افزائی کے لئے ارشاد ہوا، "بھائی! خوب لکھتے ہو، واہ واہ، ماشاءَ اللہ اور آپ کی کتابوں کی کتابت اور طباعت بھی بہت عمدہ ہے۔" اس کے بعد فرمایا: "اپنی کتابوں میں زبان آسان اور عام فہم لکھا کرو۔ تمھاری کتابیں مشکل ہوتی ہیں، جن سے عام آدمی استفادہ نہیں کر سکتا۔" اس کے جواب میں عرض کیا گیا: "اعلحضرت کی تالیفات، طبقۂ علما کے لئے ہیں اور آپ (مفتی صاحب) کی تالیفات کم پڑھے لکھے عام آدمی کے لئے ہیں۔ ایک طبقہ درمیان میں ان تعلیم یافتہ لوگوں کا ہے جو کالج اور یونیورسٹی کے ماحول سے متعلق ہے۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی تالیفات کے اسلوب اور زبان کو اس طبقے کے معیار کے مطابق رکھا جائے۔" میری یہ گزارش توجہ سے سنی اور اس وقت اس سلسلے میں مزید کچھ نہ فرمایا۔

مغرب کی نماز کے بعد حاضر ہوا تو فرمانے لگے: "آج آپ کی کتاب مقالات حصّہ اوّل کا اکثر حصّہ پڑھ گیا ہوں ایک صاحب آج کسی دوسرے شہر سے تشریف لائے تھے میرے ہاتھ میں مقالات دیکھ کر بولے اس میں اعلحضرت کیخلاف بُہت کچھ لکھا ہے میں نے پوچھا کیا لکھا ہے تو بولے لکھا ہے کہ ان میں شدّت اور غصّہ بہت تھا۔" میں نے کہا: یہ تو تعریف ہوئی دین کے معاملے میں

شدت قابل تعریف وصف ہے۔"

پھر وہ صاحب کہنے لگے: "بہت لوگوں نے اس کتاب کی مخالفت کی ہے۔"

میں نے جواباً کہا: "لوگ مخالفت کیا ہی کرتے ہیں۔"

ان صاحب نے دوبارہ کہا: "اس کی مخالفت تو اپنے سنی حضرات کر رہے ہیں۔"

میں نے جواب دیا: "جی ہاں! سُنّی حضرات ہی مخالفت کرتے ہیں۔"

اس کے بعد ایک معروف عالمِ دین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا میں نے انہیں اعلیٰحضرت قدس سرہٗ کا یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ ان کے پاس 'عمر' نام کے کسی مولوی صاحب کا لکھا ہوا فتویٰ تصدیق کے لئے بھیجا گیا۔ فتویٰ غلط تھا اور اعلیٰحضرت اس کی تردید لکھنا چاہتے تھے مگر خیال گزرا کہ یہ 'عمر' کہیں مرادآباد کے مولانا محمد عمر نعیمیؔ نہ ہوں۔ اس لئے فتویٰ روک کر حضرت صدر الافاضل مرحوم کو ٹیلیگرام دیا کہ مولانا عمر نعیمیؔ کو ساتھ لے کر فوراً بریلی پہنچو۔ حضرت نے حکم کی تکمیل کی اور بریلی حاضرِ خدمت ہو گئے۔ اعلیٰ حضرت فرمانے لگے: "بھائی! آپ کے ہاں سے ایسے غلط فتوے لکھے جانے لگے ہیں۔" حضرت صدر الافاضل مرحوم نے فتویٰ دیکھا تو عرض کیا کہ اس فتویٰ کے لکھنے والے ہمارے مولانا عمر نعیمیؔ نہیں ہیں۔ یہ اس نام کے ایک دوسرے غیر مقلد صاحب ہیں، جنہوں نے یہ فتویٰ لکھا ہے۔ یہ بات سُن کر اعلیٰ حضرت نے الحمد للہ پڑھی اور پھر اُس فتوے کی تردید کیلئے قلم اٹھایا۔

مفتی صاحب فرمانے لگے اس واقعے کے سنانے سے میرا مقصود یہ توجہ دلانا تھا کہ جن اکابر کے ہم نام لیوا ہیں، ملاحظہ کیا جائے کہ وہ اپنے احباب اور رفقا کی تردید کے سلسلے میں کس قدر توقف اور احتیاط سے کام لیتے تھے۔

مجھ سے دریافت کیا کہ آخر تمہاری مخالفت کا اصل پس منظر کیا ہے۔ میں نے عرض کیا: "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اس مخالفت کا آغاز سابق صدر ایوب کے صدارتی انتخاب کے دور سے ہوا، اُس موقعہ پر ہمارے علماء کے ایک گروہ نے عورت کے امیدوارِ صدارت ہونے کے خلاف ایک فتویٰ ترتیب دیا تھا اور پھر اُس پر علماء کے دستخط حاصل کرنے شروع کئے۔ میں نے اس فتوے پر دستخط نہیں کئے تھے اور اس کارروائی کو ناپسندیدہ قرار دیا تھا۔ بس اس کے بعد سے مختلف رنگوں میں میری مخالفت کا سلسلہ تیز کر دیا گیا"۔ میری اس گفتگو کے دوران مفتی صاحب نے فرمایا: "مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس فتوے میں میرا نام بھی شائع کیا گیا تھا لیکن مجھے اس کی خبر نہ تھی۔ یعنی میری مرضی اور اطلاع کے بغیر میرا نام شامل کر دیا گیا تھا"۔ اس ساری گفتگو کے بعد فرمانے لگے۔ "تمہاری مخالفت کرنے والے نہ تمہارے شاگرد ہیں نہ مرید میری طرف دیکھو میری شدید ترین مخالفت ان لوگوں نے کی ہے جن میں بعض میرے شاگرد اور بعض میرے مرید ہیں۔ اسی موقعہ پر گجرات کے ان لوگوں کی کارروائیوں کی کچھ تفصیل سنائی، جن کی مخالفتوں کے پیشِ نظر مفتی صاحب کو بالآخر اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنا کام محض اللہ کے بھروسے پر کرنا پڑا۔ پھر مجھے مخاطب کر کے فرمایا: "قاضی صاحب! اپنا کام کئے جاؤ لوگوں کی باتوں سے مت گھبراؤ اور نہ ان کا اثر لو"۔ عرض کیا: "اندیشہ صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ تک پہنچائی جاتی ہیں، مبادا کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے"۔ فرمانے لگے: "میں ان لوگوں کو خوب جان گیا ہوں اور بہت تجربہ ہو چکا ہے۔ بس آپ اپنا کام تسلی کے ساتھ کئے جاؤ"۔

اسی نشست میں میرے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا: "جب میں علوم دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہوا اس وقت میری عمر بیس برس کی تھی۔ اس موقعہ پر ہمارے ایک عزیز[1] نے

---

[1] یہ مفتی صاحب قدس سرہٗ کے برادرِ عمزاد، جناب عزیز خان مرحوم و مغفور تھے۔ ان کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ "دیکھئے" طالب علمی "کے زیرِ عنوان (صفحہ ۲۴ پر) گزر چکا ہے۔

ایک قطعۂ تاریخ بھی لکھا تھا جس سے ۱۳۴۴ ھجری کا سال نکلتا ہے۔ میں اسی سال میں فارغ ہوا تھا۔ نیز بتایا کہ والدِ ماجد کی تاریخ وفات ٹھیک یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ جن دنوں میں، میں کچھوچھہ شریف میں مدرس تھا۔ اُسی دور میں اُن کا انتقال ہوا تھا، اور ہمارے محمد میاںؒ بھی اسی دور میں پیدا ہوئے تھے۔

---

۷ ر اکتوبر ۱۹۷۱ء
(پونے دس بجے صبح)

آج صبح حاضر ہوا کہ چارپائی پر لیٹے ہوئے میری تالیف "شاہدِ جیلاں" پڑھ رہے تھے مجھے دیکھ کر فرمایا آئیے آپ سے ہی ملاقات کر رہے ہیں، دیکھ لیجئے (اور شاہدِ جیلاں کی طرف اشارہ کر دیا) اور میں نے مقالات حصہ اوّل کی تقدیم ساری پڑھ لی ہے وہ مقام بھی پڑھ لیا ہے جہاں . . . . کو اعتراض ہوگا۔ آخر میں ہے نا؟ عرض کیا: ہاں، اس کے بعد فرمایا اچھا آج "تحقیقِ قربانی" شروع کرتے ہیں۔ شروع کا کچھ حصہ پڑھ کر سنائیے۔ میں نے کتاب کا ابتدائیہ (صفحہ ۹ تا ۱۴) پڑھ کر سنایا۔ بہت محظوظ ہوئے بار بار واہ واہ، سبحان اللہ اور ماشاء اللہ کہتے رہے، "قافلے اور اجنبی مسافر کی مثال کو خاص طور پر سراہا۔

آج ہی فرمایا:

"میں نے قرآن پاک کی خدمت کرنے میں بہت برکات دیکھی ہیں۔ میں کہتا ہوں جب سرکار کسی کو نوکر رکھ لیتے ہیں تو پھر اسے مالِ دنیا اور سرمایۂ دینی تو دیتے ہیں، سکونِ قلب کی دولت بھی عطا فرماتے ہیں جو اور کہیں نہیں ملتی اور قاضی صاحب! میں نے ملازمتوں کے بعد اس دور میں بے حد اطمینانِ قلب اور برکتوں کا ذخیرہ پایا ہے۔ یہ دور، جو اب دیکھا ہے

لہ یعنی مفتی صاحب قدس سرہٗ کے بڑے صاحبزادے، مولانا مفتی مختار احمد صاحب زید مجدہٗ وسلّمہ ربہٗ۔

عجیب وغریب ہے۔ اس کی لذت ہی کچھ اور ہے سچی بات ہے پہلے تو ہم اسی چکر میں رہے یہ انجمن ہوتی ہے اور یہ اراکین ہوتے ہیں، یقین جانئے میں نے ساری عمر درس دیا، لیکن اب جو درس میں لطف مجھے خود محسوس ہوتا ہے یہ ایک نئی چیز ہے جو اس دور میں انعامِ خاص محسوس ہوتی ہے۔"

عرض کیا: "مجھے کامل توقع تھی کہ یہ دور آپ کی زندگی میں ضرور آکے رہے گا،" اس پر تبسم کے ساتھ فرمایا اچھا تو پھر یہ آپ کی کرامت سمجھی جائے۔"

اسی نشست میں مدینہ منورہ سے پارکر قلم ملنے کا واقعہ سُنایا۔ فرمانے لگے میں نے بازار میں پارکر قلم (۵۱) دیکھا تو مجھے بے حد پسند آیا، خواہش پیدا ہوئی کہ یہ قلم میرے پاس ہونا چاہئے مگر اس کے بیش قیمت ہونے کا بھی مجھے بخوبی اندازہ تھا اس لئے بازار سے چپکا چلا آیا اور دل ہی دل میں یہ خیال کرتا رہا کہ مدینہ منورہ میں آیا ہوا ہوں اگر یہ قلم سرکار کی طرف سے بطور عطیہ ملے تو زہے نصیب، غالباً اسی روز یا دوسرے دن مسجدِ نبوی میں نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دوستؒ مجھے ملنے کے لئے آگے بڑھے اور یہ کہتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا کہ آپ کے لئے ایک تحفہ لایا ہوں۔ اب جو میں دیکھتا ہوں تو انھوں نے ــــــــ - - - - - - - - -

میرے سامنے وہی پارکر قلم (۵۱) رکھ دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میری آرزو پوری کی گئی ہے اور میرا مطلوبہ عطیہ مجھے مل گیا ہے کیا عرض کیا جائے ان کی کیسی کیسی کرم فرمائیاں ہیں مجھ پر (اور آبدیدہ ہو گئے) اس کے بعد فرمایا مذکورہ قلم کو میں نے صرف تفسیر لکھنے کے لئے خاص کر لیا ہے اس سے نہ فتویٰ لکھتا ہوں نہ تعویذ نہ کوئی اور چیز۔ اور

لہ مفتی مختار احمد صاحب نے بعد میں مجھے بتایا کہ والد مرحوم کے یہ دیرینہ دوست یوپی کے جناب ہاشم رضا صاحب ہیں۔ جو آجکل بینک آف بہاولپور ڈھاکہ میں جنرل منیجر ہیں۔

تفسیر والی نوٹ بک (مسودے کی فائل) کے شروع میں مَیں نے یہ شعر لکھ دیا ہے۔

ہونٹ میرے ہیں مگر ان پہ کرم ہے تیرا
انگلیاں میری ہیں مگر ان میں قلم ہے تیرا

"جب یہ قلم لے کر لکھنے بیٹھتا ہوں تو ایسے ایسے مضامین ذہن میں آتے ہیں کہ میں خود حیران رہ جاتا ہوں۔ قاضی صاحب یہاں آپ سے انشاء اللہ خوب ملاقاتیں ہوتی رہیں گی آپ کو کچھ بتاؤں گا کہ مجھ پر حضورؐ کے کیسے کیسے کرم ہوئے۔"

عرض کیا گیا: "جب دنیا پرستوں کی طرف دستِ احتیاج دراز نہ کیا جائے اور ان کی مدح سرائیوں سے اپنی زبان کو محفوظ رکھا جائے تو پھر ادھر سے خاص کرم فرمائیاں ہونے لگتی ہیں۔ اہلِ دنیا کی مدح سرائی سے محفوظ رہنے کے مضمون پر حضرتِ عطار کا یہ شعر میں نے پڑھ کر سنایا:

بہ عمرِ خویش مدحِ کس نہ گفتم
دُرے از بہرِ دُنیا من نہ سفتم

فرمایا: یہ شعر مجھے لکھ دو اور وہی لفافہ نکال کر میرے آگے رکھا جس کے ایک کونے پر ۲۸۔اکتوبر کو اقبال مرحوم کا ایک فارسی شعر[۱] مجھ سے لکھوایا تھا۔ عرض کیا گیا، اقبال کا شعر تو پانی سے دُھل گیا ہے، فرمایا: اب تو میرے سینے میں آچکا ہے۔

---

[۱] ۲۸۔اکتوبر کو ہسپتال میں داخلہ ہونے کی غرض سے آئے تھے اور آؤٹ ڈور سرجیکل وارڈ میں بیٹھے ہوئے، میں نے اقبال کا یہ شعر سنایا تھا:

تو ندانی عشق و مستی از کجا ست
ایں شعاع از آفتاب مصطفیٰؐ ست

۹-اکتوبر ۱۹۷۱ء

آج آپریشن کے بعد، دُوسرا روز تھا۔ گو مفتی صاحب کی طبیعت اچھی تھی، تاہم یہ خیال رکھا گیا کہ آپ سے ایک دُو روز تک زیادہ باتیں نہ کی جائیں، اور آرام کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کیا جائے۔ اس خیال کے پیشِ نظر ہم لوگ، آپ سے مخاطب ہونے کی کوشش نہ کرتے، مگر آپ ہماری دلجوئی کے لئے، وقتاً فوقتاً از خود چھوٹی چھوٹی محبت آمیز باتیں ارشاد فرماتے ہی رہے۔ جب بات سننے کے لئے میں، یا برادرم مفتی مختار آگے بڑھ کر قریب ہوتے، تو ہمارا ہاتھ، اپنے ہاتھ میں باندازِ شفقت پکڑ لیتے اور دیر تک پکڑے رہتے۔ چھوٹا بھائی عبدالمصطفےٰ کامل، حاضرِ خدمت ہوا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے قریب کھینچ لیا۔ پُوچھا: "آپ کا نام کامل ہے نا؟" اس نے جواب میں عرض کیا: "جی ہاں"۔ تو فرمانے لگے: "بھئی تم واقعی کامل ہو، بہت اچھا لکھتے ہو، تحریر و تالیف کا کام جاری رکھو۔ تاریخ کے موضوع پر، اور سیرت و تذکرہ کے موضوع پر ہمارے ہاں کوئی خاص کام نہیں ہوا۔ اس پر لکھو، تحقیق سے لکھو، مگر باندازِ محبت و عقیدت لکھو۔" اور بطورِ مثال گلستان میں درج، آلِ سبکتگین کے کسی بادشاہ کا وُہ خواب کا واقعہ سنایا، جس میں اس نے دیکھا کہ منہ کے سارے دانت گِر گئے ہیں۔ اس کی تعبیر ایک صاحب نے یُوں بتائی کہ تمہارے سب قرابت دار تمہارے سامنے مر جائیں گے۔ مگر دوسرے نے اسی کو یہ انداز دے دیا کہ بادشاہ کی عمر اپنے تمام اہلِ خاندان کی عمروں سے لمبی ہوگی۔ اس سے بادشاہ بہت محظوظ ہوا۔ یعنی صرف انداز کی تبدیلی سے، بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

آج مولانا احمد علی[۱] صاحب قصوری عیادت کے لئے ہسپتال میں آئے۔

---

[۱] مولانا احمد علی صاحب قصوری بی۔ اے، ہمارے نوجوان علماء میں ممتاز ہیں۔ انہوں نے درسِ نظامی کی اکثر تعلیم، بصیر پور میں، استاذ العلماء حضرت مولانا نور اللہ صاحب بصیر پوری نعیمی دامت برکاتہ،

(باقی اگلے صفحہ پر)

۱۲۔اکتوبر ۱۹۷۱ء

آج قبلِ دوپہر ہسپتال میں حاضر ہوا، میرے ایک دوست مولانا عبدالحکیم شرفؔ[1] بھی میرے ساتھ مفتی صاحب کی عیادت کے لئے ہسپتال آ گئے، مولانا نے اپنے تالیف کردہ بعض رسائل مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کئے۔ آپ ان رسائل کو دلچسپی سے دیکھتے رہے اور ان کی تحسین فرمائی۔

آج شام کو جب دوبارہ حاضرِ خدمت ہوا، تو فرمانے لگے کہ مولانا عبدالحکیم

(بقیہ حاشیہ صہ ۱۲۵)

سے پائی اور کچھ عرصہ کے لئے جامعہ نعیمیہ لاہور میں، حضرتِ علّام مفتی محمد حسین صاحب نعیمی کے ہاں بھی زیرِ تعلیم رہے، سندِ فراغت حاصل کر کے انھوں نے پہلے ملازمت اور اس کے بعد تجارت کا مشغلہ اپنا لیا۔ دینی و ملی خدمات اپنے ذوق و شوق سے انجام دیتے ہیں۔ وہ کئی سال سے، شادباغ اور قلعہ گوجر سنگھ میں خطابت کے فرائض ادا کرتے رہے ہیں، آجکل، موتی مسجد (سرائے رتن چند متصل میو ہسپتال) میں خطبۂ جمعہ دیتے ہیں۔

قصوری صاحب، خدماتِ دینی و ملی کے سلسلے میں، میرے خاص رفیق ہیں۔ گزشتہ تین چار برس سے، مجھے اور میرے احباب کو، ان کی مخلصانہ رفاقت حاصل ہے۔

[1] مولانا عبدالحکیم شرفؔ ہمارے نوجوان فاضل احباب میں ہیں۔ انھوں نے جامعہ رضویہ لائلپور، جامعہ نظامیہ لاہور، اور دارالعلوم امدادیہ مظہریہ بندیال میں، درسِ نظامی اور دینیات کی تعلیم پائی۔ اس کے بعد انھوں نے تدریس اور تالیف کی خدمات کی طرف توجہ کی۔ وہ گزشتہ چھ برس سے جامعہ نعیمیہ لاہور، جامعہ نظامیہ لاہور اور دارالعلوم رحمانیہ ہری پور ہزارہ میں تدریس کے فرائض انجام دیتے آئے ہیں۔ اس سال مدرسہ اشاعت العلوم چکوال میں منتقل ہو رہے ہیں۔ "یادِ اعلیٰحضرت" اور "مسائل اہلسنت" وغیرہ ان کی تالیفات طبع ہو چکی ہیں۔

ماشاء اللہ فاضل آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ رسائل خوب لکھے ہیں۔ میں نے ایک نظر ان پر ڈالی ہے۔ عرض کیا گیا: یہ مولانا عبدالحکیم حضرت مولانا علامہ عطا محمد بندیالوی[1] صاحب کے تلامذہ میں ہیں۔ فرمایا: اچھا، یہی باعث ہے۔ میں نے ان کے اکثر شاگرد قابل ہی دیکھے ہیں۔

---

[1] استاذ العلماء، ملک المدرسین حضرت علامہ عطا محمد صاحب اس وقت ہمارے حلقۂ علمائے اہلسنت میں متقدمین اساتذۂ معقول و منقول کی وراثت علمیہ کے وارث و امین ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں پدھراڑ (سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ حافظ الٰہی بخش صاحب (دوسال۔ جہلم) اور مولانا قاضی محمد بشیر صاحب سے ابتدائی تعلیم پائی۔ اس کے بعد علامۂ وقت مولانا یار محمد بندیالوی قدس سرہٗ سے بندیال (سرگودھا) میں، اور استاذ الفضلاء، علامہ مہر محمد علیہ الرحمۃ سے اچھروالا میں پڑھتے رہے۔ چند ماہ انگی (گجرات) میں بھی سلسلۂ تعلیم رہے۔ آخر میں بیلاں (میانوالی) میں امام المعقول والمنقول مولانا غلام محمود قدس سرہٗ کے ہاں، علوم و فنون کی تکمیل کی اور بغداد شریف میں حاضر ہو کر، السید الشیخ مولانا عبدالقادر آفندی بغدادی خطیب جامع امام اعظم سے فقہ و حدیث کی سند حاصل کی۔

حضرت علامہ عطا محمد، غوث الاسلام والمسلمین سید مہر علی شاہ قدس سرہٗ کے دست مبارک پر بیعت ہوئے۔ حضرت علامہ کا ایک سلسلۂ تلمذ، دو واسطوں سے مولانا فضل حق خیرآبادی سے، اور دوسرا تین چار واسطوں سے مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے جاملتا ہے۔ یہ دونوں خاندان، برعظیم میں، علم و فضل کے وارثین خصوصی کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔ حضرتِ علامہ ملک کے نامور مدارس دینیہ میں پچھلے بیس پچیس برس سے، مسند آرائے تدریس چلے آرہے ہیں۔ گزشتہ کئی برسوں سے آپ دارالعلوم امدادیہ مظہریہ بندیال میں، مرکز فیض بنے ہوئے ہیں۔ اس سے قبل، دارالعلوم فتحیہ اچھرہ لاہور، دارالعلوم حزب الاحناف لاہور، مدرسہ اسلامیہ رانیال (ضلع حصار) بھیرہ ضلع سرگودھا، سیال شریف اور گولڑہ شریف میں سالہا تدریس کی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

حضرت علامہ نے اس دور میں، جس محنت اور ذوق سے تدریس کا کام کیا ہے۔ اس کی مثال

(باقی اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد دیر تک حضرت علامہ بندیالوی کا تذکرہ فرماتے رہے۔ ان کے کمالِ علمی کے علاوہ ان کی خوش خلقی اور حُسنِ تواضع کی بھی تعریف فرمائی۔ اس سلسلے میں واں بھچراں کے ایک جلسے کا حال سُنایا۔ فرمایا:

اس جلسے میں تقریر کے لئے میں بھی مدعو تھا۔ سٹیج پر عظیم اور جیّد علماء موجود تھے اور علامہ بندیالوی بھی تشریف فرما تھے، جب یہ بات شروع ہوئی کہ جلسے کی صدارت کون کرے تو علامہ بندیالوی بولے: "مفتی صاحب کے ہوتے ہوئے اور کون صدر ہو سکتا ہے۔" بہرحال مجھے تقریر کے لئے بہ اصرار کرسی پر بٹھایا، اور خود دیگر علماء سمیت کُرسیاں چھوڑ کر نیچے بیٹھ گئے مجھے اس صورتِ حال کو قبول کرنے پر ایسا مجبور کر دیا گیا کہ میں دل ہی دل میں اس متواضعانہ

(بقیہ حاشیہ ص۱۲۷)

مشکل مقی ہے۔ ان کی نسبتِ تلمذ نہایت فیض بخش ہے، اور ان کے اکثر تلامذہ، ہر جگہ کے فضلاء اور بہترین مدرس ثابت ہوئے ہیں۔ مولانا محمد عبدالحق بندیالوی، مولانا اللہ بخش صاحب (مظفریہ واں بھچراں)، مولانا پیر محمد صاحب (پشاور)، مولانا فضل السبحان صاحب (مردان) اور مولانا غلام رسول سعیدی (نعیمیہ لاہور) ان کے چند معروف تلامذہ ہیں۔

راقم الحروف دو تین بار حضرت علامہ بندیالوی کی ملاقات سے مشرف ہو چکا ہے، غایت لطف و شفقت فرماتے ہیں۔ (کوکب)

[1] اس جلسہ میں، استاذ العلماء مولانا محمد سعید صاحب (جو ابتدائی کتب میں، حضرت علامہ بندیالوی کے استاذ ہیں) بھی موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جلسے کی صدارت بہرنوع، علامہ بندیالوی ہی کے ذمے ڈالی گئی مگر مفتی صاحب کے بیان کو ساتھ ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سٹیج پر تمام علماء بشمول صدر کرسیوں پر نہیں بیٹھے۔ کرسی صرف مفتی صاحب کے لئے رکھی گئی۔ سٹیج پر مولانا اللہ بخش صاحب، اور مولانا عبدالحق صاحب (ابن استاذ العلماء)، مولانا یار محمد بندیالوی قدس سرہٗ بھی موجود تھے۔

اخلاق پر متعجب اور اپنے پہ نادم ہوتا رہا۔ اس کے بعد، مفتی صاحب نے زور دے کر ارشاد فرمایا: "دیکھو بھائی! میری ایک بات لکھ لو جہاں کمال ہوگا وہاں تواضع ہو گی اور جہاں کمال نہیں ہوگا وہاں تکبر ہوگا۔"

آج شام کی اسی نشست میں مجھے بتایا کہ آج میری بیمار پرسی کے لئے علامہ سید ابوالبرکات صاحب اور ان کے صاحبزادے مولانا محمود رضوی تشریف لائے تھے، مولانا اکرام حسین صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ مفتی صاحب نے خاص طور پر فرمایا، سید صاحب بڑی محبت سے ملے ہیں۔[1]

۱۳۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء

آج شام کی نشست میں فرمایا: آج مولانا مفتی محمد حسین صاحب نعیمی تشریف لائے تھے نیز بتایا کہ محترم مولانا نور اللہ صاحب بصیر پوری بھی آج میری عیادت کیلئے تشریف لائے۔[2]

آج کی باتوں میں ایک خاص ارشاد یہ تھا کہ سرفراز گکھڑوی صاحب کو حضرت صدرالافاضل کی تفسیر میں ہی نقائص نظر آئے ہیں اور اشرف علی تھانوی صاحب کے ترجمے کو کبھی انہوں نے غور سے نہیں پڑھا تھانوی صاحب نے اپنے ترجمۂ قرآن میں آیت کریمہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا

---

[1] حضرت علامہ ابوالبرکات، اور ان کے ساتھ دیگر علمائے مختصر تذکرے، قلتِ وقت کے باعث مرتب نہیں کے جا سکے۔ آئندہ ایڈیشن کے لئے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

[2] محترم مفتی نعیمی صاحب اور حضرت مولانا نور اللہ بصیر پوری کے مختصر تراجم بھی، عجلت کے پیش نظر اس ایڈیشن میں شامل نہیں کئے جا سکے۔

رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ کے نیچے " العالمین " کا ترجمہ " مکلفین[1] " سے کیا ہے یعنی حضورؐ کی رحمت کو مکلفین کے دائرے تک محدود کرنا چاہا ہے کیا یہ نرالا ترجمہ گھمڑوی صاحب کو نظر نہیں آیا۔

آج ہی کی گفتگو میں مجھے ارشاد فرمایا محمود عباسی کی کتاب رشید بن رشید دیکھو ، اور اس کے جواب کے متعلق غور کرو۔ اگر وقت نکال کر جواب لکھ لو، تو اسے یادِ شہید کا ضمیمہ بناکر اس کتاب کو دوبارہ شائع کر دو ، بعد میں فرمانے لگے اچھا لاؤ اپنی کتاب "یادِ شہید" اور اس کا کچھ حصہ مجھے پڑھ کر سناؤ۔ میں نے تعمیل شروع کر دی (پچھلے دو دن سے یادِ شہید پڑھ رہے ہیں اور سُن رہے ہیں تحقیق قربانی اس سے پہلے پڑھی جا چکی ہے ۔) یادِ شہید سُنتے ہوئے متعدد مقامات پر ترمیم و اضافہ اور بعض حوالوں کے درج کرنے کا مشورہ ارشاد فرمایا ۔ (میں نے ایسے تمام مقامات پر نشان لگائے ہیں۔ انشاءاللہ نئے ایڈیشن میں حسبِ ارشاد تعمیل کی جائے گی) یادِ شہید کے اندازِ بیان کی بالعموم تحسین فرمائی ۔ ایک پُرلطف بات یہ ہے کہ یادِ شہید کا انتساب میں نے مفتی صاحب ہی کے نام کیا ہے ۔ جب کتاب کے آغاز سے یہ انتساب پڑھ کر سنایا تو خاص انداز میں فرمانے لگے یہی تو باعث ہے لوگوں کی مخالفت کا ، پھر کہتے ہو لوگ کیوں تمہارے مخالف ہو گئے ہیں۔

---

[1] مکلفین ، مکلف کی جمع ہے ۔ عاقل اور بالغ مسلمان ، جس پر شریعت کے احکام نافذ ہوتے ہیں ، مکلف کہلاتا ہے ۔ " العلمین " کا ترجمہ " مکلفین " کے ساتھ اس لئے کیا جا رہا ہے کہ حضور کی رحمت کو تمام اہلِ عالم کے بجائے ، صرف انسانوں کے ایک خاص طبقے تک محدود ثابت کیا جائے ۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ لوگ " ربّ العلمین " کا ترجمہ کیا کریں گے ! (مرتب)

۱۴ / اکتوبر ۱۹۷۱ء

آج صبح کے وقت حاضر ہوا تو یادِ شہید کے تیسرے باب " سوالات و جوابات" کے بارے میں ارشاد فرمایا:۔

" یہ مباحث بڑے اہم اور ضروری ہیں۔ مگر انہیں آسان واضح اور سلجھے ہوئے انداز میں تحریر کرنا چاہیئے۔ آپ نے سوالات بڑے اہم اٹھائے ہیں۔ مگر انہیں کئی کئی ٹکڑوں میں تقسیم کرنے اور اسی طرح ان کے جوابات کو بھی شق در شق بانٹنے سے بات طویل ہو جاتی ہے اور کسی حد تک الجھ کر رہ جاتی ہے جس سے اصل مبحث کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس حصۂ کتاب کو طبع دوم کے موقع پر دوبارہ لکھا جائے اور ان مباحث کو مزید بہتر طریقے سے پیش کیا جائے ۔"

عرض کیا گیا: " انشاء اللہ العزیز ایسا ہی کیا جائے گا۔"

مغرب کے بعد دوبارہ حاضر ہوا۔

اس وقت کی حاضری ایک خاص رنگ اختیار کر گئی۔ ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد مفتی صاحب کا اصرار یہ تھا کہ ہسپتال ہی کا کھانا کھایا جائے۔ دراصل انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ میرے متعلقین میری وجہ سے زحمت اٹھا رہے ہیں۔ مگر خیر ہم نے بار بار زور ڈال کر یہ منوا لیا کہ دن کا کھانا مولانا احمد حسن نوری اور شام کا کھانا راقم السطور کے ہاں سے آیا کرے گا۔ آج شام جب کھانا لے کر جانے کا وقت ہوا تو اچانک طوفان باد و باراں اٹھا۔ آندھی بڑے زور کی چلنے لگی اور بارش بھی شروع ہو گئی۔ ذرا توقف کیا کہ بارش اور آندھی کچھ تھم جائیں تو چلا جائے مگر کھانے کو دیر ہوتی جا رہی تھی اور موسم میں کوئی خاص فرق پڑتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے چھوٹے بھائی (عبدالرسول عامر) کو ساتھ لیا اور کھانا لیکر نکل پڑے۔ جب ہسپتال کی حدود میں داخل ہوئے تو میرا دل ڈر رہا تھا کہ کہیں مفتی صاحب نے یہ سمجھ کر کہ آج

موسم خراب ہے کھانا گھر سے نہیں آئے گا، ہسپتال کا کھانا لیکر کھا نہ لیا ہو۔ میں دل ہی دل میں دعائیں کرتا آ رہا تھا کہ ایسا نہ ہوا ہو۔ عجیب اتفاق دیکھئے کہ جب مفتی صاحب ہاتھ دھو کر ہسپتال کا کھانا شروع کیا ہی چاہتے تھے تو ہم ان کے بستر کے قریب جا کھڑے ہوئے اور سلام عرض کیا۔ ہم بارش میں قدرے بھیگ گئے تھے، دیکھا تو سخت حیران ہوئے فرمانے لگے: "آج تمہیں کس نے کہا تھا کہ کھانا لاؤ" "ہسپتال سے کھانا لے لیا تھا۔ آج یہی کھا لیتا تو کیا حرج تھا" "بھئی میں تو دعا کر تا رہا ہوں کہ آج کوئی صاحب کھانا لے کر نہ آئیں، گھر سے باہر نہ نکلیں" "دیکھو تو کیسی تیز آندھی ہے اور بارش بھی زور کی" "اُوہ بھئی کمال کر دکھایا آپ نے" "میں تو حیران ہوں کہ آج اس موسم میں آپ یہاں تک پہنچے کیسے ہیں"۔

یہ ساری باتیں جلدی سے مگر چھوٹے چھوٹے وقفوں کے ساتھ فرما گئے۔ میں مطمئن اور مسرور کھڑا تھا کہ الحمد للہ ہماری محنت رائیگاں نہیں گئی اور ہم کھانا لے کر ٹھیک وقت پر پہنچ گئے ہیں۔

مفتی صاحب کھانا کھانے لگے مگر ان کے چہرے کے تاثرات، ملے جلے جذبات کے ایک ہلکے تلاطم کا پتہ دے رہے تھے۔ ایک طرف ہمارے شوق اور مستعدی پر راحت و اطمینان اور دوسری طرف یہ شدید احساس کہ یہ لوگ میری وجہ سے زحمت میں پڑے ہوئے ہیں۔

کھانا کھاتے ہوئے خاندان قادریہ فاضلیہ (بٹالہ والوں) کے مورث[1] اعلیٰ کا واقعہ سنایا کہ وہ گیارہ سال تک متواتر اپنے پیر و مرشد کا کھانا لے کر جاتے رہے۔ آخر ایک رات شدید آندھی اور بارش عین اسی وقت آ گئی جس وقت وہ گھر سے نکلا کرتے تھے موسم کی خرابی پر تردد ہونے لگا تو والدہ نے کہا: "بیٹا آج ناغہ نہ کرنا آج جاؤ گے تو گیارہ سال کی محنت کا پھل مل جائے گا" اس روز گھر

---

[1] الشیخ محمد فاضل الدین بٹالوی، ابو الفرح، مفصل حالات کیلئے دیکھئے خزینۃ الاصفیا اور نزہۃ الخواطر

گجریلا پکا تھا۔ والدہ نے ٹوکرے میں گجریلے کا پتیلا رکھ دیا اور دوسرا ٹوکرا اوپر الٹا دے دیا اور سر پر رکھوا دیا۔ بارش میں اسی کیفیت کے ساتھ چلتے رہے۔ پانی کے قطروں سے پتیلے کے نچلے حصّے کی سیاہی دھل کر سر اور چہرے پر پڑتی رہی۔ بہر حال اسی ہیئت کذائی کے ساتھ مرشد کے دروازے پر جا پہنچے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس موسم میں بھی آگیا ہے فرمایا "اچھا دیکھو تو تمہارے لئے طاقچے میں ایک چیز رکھی ہے اٹھا لاؤ۔" دیکھا تو گنا تھا فرمایا "اسے کھاؤ جتنی گرہیں گنے کی ہیں اتنی پشت تک تمہاری اولاد میں کاملین ہوں گے۔"

واقعہ سنانے کے بعد مفتی صاحب فرمانے لگے: "بھئی میں کیا دے سکتا ہوں۔ اللہ تعالےٰ تمہارے علم میں، ایمان میں، عمل میں اور عمر میں برکت ڈالے۔ صحت و تندرستی دے۔ اچھی بیوی عطا کرے۔" اور ایسے ہی الفاظ میں دیر تک دعائیں دیتے رہے۔ مجھے سارے الفاظ محفوظ نہیں رہے۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو عرض کیا گیا آج کامونکی جلسے میں بھی جانا ہے۔ رات کے آٹھ بجنے والے تھے فرمایا: "اس وقت اور ایسے موسم میں؟" چھوٹے بھائی نے کہا "وعدہ کر چکے ہیں اب ہر حال میں جانا چاہئے چاہے کچھ ہو۔" تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا: "جب آپ پہنچیں گے تو وہ لوگ حیران رہ جائیں گے۔" عرض کیا: "انہیں توقع ہوگی کہ ضرور پہنچ جائے گا۔" "اچھا آپ کی طبیعت سے واقف ہوں گے۔" "اچھا بھئی جاؤ خدا کی امان اور اس کی حفاظت میں۔"

آج ہی فرمایا کہ "آج دن کے وقت حضرت مولانا غلام علی صاحب اوکاڑوی عیادت کے لئے تشریف لائے تھے۔ نیز مولانا غلام رسول سعیدی اور مولانا عبدالحکیم شرف صاحبان بھی آج ملاقات کے لئے آئے۔ مولانا سعیدی اپنی تالیف "توضیح البیان" کا ایک نسخہ دے گئے۔ مولانا شرف آج دوسری بار تشریف لائے تھے۔

۱۵ اکتوبر جمعہ

بارہ بجے دن کے قریب ہسپتال حاضر ہوا تو فرمایا:" آیئے قاضی صاحب! آج ہم منتظر بیٹھے ہیں ہمیں اپنا رات کا سفرنامہ سنایئے۔" اس پر کاموکے جہاد کانفرنس کی تفصیل سنائی گئی، آپ ساتھ ساتھ استفسار کر کے آمد و رفت کے حالات پوچھتے رہے۔ مطلب یہ تھا کہ آندھی اور بارش کے موسم میں سفر کس طرح گزرا، جب سب کچھ عرض کر دیا گیا تو فرمانے لگے:" بھئی! میرا خیال غلط نکلا سمجھتا تھا کہ ماشا اللہ ہمارے محمد میاں سفر کے معاملے میں بڑے بہادر ہیں مگر آپ تو ان سے بھی آگے نکلے۔ کس قدر خوفناک طوفان تھا رات، اللہ اور ہمت عطا کرے۔"

اس کے بعد یادِ شہید کی آخری فصل" شہدا کی یاد منانے کا طریقہ" کا ابتدائی حصہ پڑھوا کر سنا اور یہ مشورہ دیا کہ اس میں اپنے الفاظ میں یہ مضمون بڑھا دینا:" ہر بڑے باکمال شخص کی یاد ایسے طریقے سے منائی جاتی ہے جو اس کے کمالات سے مناسبت رکھتا ہو مثلاً شاعر ہو گا تو اس کی یاد میں مشاعرہ اور شعر و ادب کی محفلیں منعقد کی جائیں گی۔ وعلیٰ ھذا القیاس! لہٰذا شہید کی یاد اور بالخصوص سیدنا امام حسین علیہ السلام کی یاد ایسے انداز میں منائی جانی چاہیئے جو ان کے کردار سے مناسبت رکھتا ہو، وہ نمازی تھے، متقی تھے، پرہیزگار تھے اور صابر و شاکر تھے۔ اگر ان کی یاد مناتے ہوئے نماز اور تقویٰ چھوڑ دیا جائے اور صبر کے بجائے بے صبری کا اظہار کیا جائے تو ایسی یاد ان کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی اور نہ ہی قابلِ قبول۔" عرض کیا گیا انشاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں تعمیلِ ارشاد کر دی جائے گی۔

رات کے وقت دوبارہ حاضر ہوا تو عشاء کی نماز کے لئے بستر سے اٹھ کر برآمدے میں تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ وہیں پہنچا۔ فرض، جماعت کے ساتھ پڑھ چکے تھے سنت، وتر پڑھ کر اٹھے تو ساتھ ہو لیا۔ بستر کی طرف جاتے ہوئے راستے میں یہ گفتگو شروع فرما دی:" مجھے ایک دعا میری ماں نے

دی تھی اور ایک دعا باپ نے، میں دیکھتا ہوں کہ وہ دونوں پوری ہوئی ہیں۔ والدِ ماجد فرمایا کرتے: "میرا بیٹا جہاں رہے لوگ اسے بڑا عالم سمجھیں"۔ تو دیکھ لو میں کیا ہوں اور کیا میری حقیقت لیکن جس جگہ رہا اپنے پرائے سب نے حتیٰ کہ شدید ترین مخالفوں نے بھی یہ ہمیشہ تسلیم کیا کہ مفتی صاحب ہیں عالم۔ یہ محض والدِ مرحوم کی دعا کا نتیجہ ہے اور والدہ نے فرمایا تھا "میرا بیٹا جہاں کہیں ہو رزق اس کے آگے پہنچے"۔ یہ بھی دیکھ لو کہ اب یہاں ہسپتال میں پڑا ہوں لیکن رب کی ساری نعمتیں یہاں پہنچ رہی ہیں اور بعض اوقات اس سلسلے میں حیرت انگیز واقعات بھی پیش آتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی سفر میں، رات ایک چھوٹے سے گاؤں میں آگئی۔ اپنی جان پہچان وہاں کوئی نہ تھی گاؤں کے کنارے پر ایک چھوٹی سی نیم آباد مسجد میں رات گزاری۔ صبح فجر کی نماز پڑھی تو سخت بھوک محسوس ہوئی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہاں کہیں قریب کوئی چیز کھانے کی مل سکے گی کہ اتنے میں ایک اجنبی ایک تھال لئے ہوئے مسجد میں داخل ہوا اور وہ تھال میرے سامنے رکھ کر کہنے لگا۔ "کھائیے"۔ کپڑا اٹھایا تو تھال میں عمدہ ناشتہ تھا۔ میں نے اس شخص سے پوچھا کہ "آپ یہ کیوں اور کیسے لائے ہیں؟" وہ بولا "بس ایسے ہی آج میرا جی چاہ رہا تھا کہ مسجد میں ناشتہ لے کر جاؤں شاید کوئی مسافر ہو"۔

اس کے بعد مزید فرمانے لگے: "دیکھو بیٹا اپنی ماں کو راضی رکھنا اور ان سے دعا لینا، جس شخص کی والدہ زندہ ہو مجھے اس پر رشک آتا ہے یہ بہت بڑی نعمت ہے بشرطیکہ دعائیں لی جائیں۔ ایک ہے دعا کرانا اور ایک ہے دعا لینا دونوں میں فرق ہے۔ ایک مثال سے یہ فرق سمجھاتا ہوں۔ گجرات میں حضرت سائیں کاواں والے زندہ تھے تو ان کے پاس ایک سید صاحب آئے اور کہنے لگے "سائیں میرے لئے دعا کر" سائیں صاحب کی جلالی طبیعت تو معروف تھی ہی بولے "اچھا کراں گے"۔ سید صاحب نے کہا "کراں گے نہیں ابھی کر"۔ سائیں صاحب نے پھر یہی بات دہرائی تو سید صاحب جوش میں آگئے۔ معلوم ہوتا ہے وہ

بھی کوئی بڑے زور کے سید تھے۔ اٹھے اور سائیں صاحب سے گتھم گتھا ہو گئے، سائیں صاحب کو نیچے گرا لیا اور خود ان کے اُوپر چڑھ بیٹھے اور کہنے لگے "کر دعا ابھی کر اور فو کر"؛ سائیں صاحب سادات کا بڑا احترام کرتے تھے فرمانے لگے "اچھا سید! دعا کرتا ہوں جا اللہ تیرا بھلا کرے"؛ تب کہیں سید صاحب نے پیچھا چھوڑا۔[1] مفتی صاحب فرمانے لگے "یہ ہے دعا کرانا لیکن میں کہتا ہوں کہ دعا لی جائے ایسے طریقے سے کہ خود بخود دل سے دعا نکلے۔

اسی نصیحت کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا والدہ کو ساتھ لے کر حج پہ جانا۔ میں بھی اپنی والدہ کو حج پہ لے کر گیا تھا۔ ایک دن ہم ماں بیٹا مسجدِ نبویؐ میں روضۂ اطہر کے قریب بیٹھے ہوئے تھے کہ مجھ پر عجیب رقت طاری ہوئی تو میں نے اپنی والدہ کے قدم پکڑ لیے اور عرض کیا: "میں ساری زندگی آپ سے دور پردیس میں ہی رہا ہوں مجھے معاف کر دو اور میرے لئے دعا کرو۔

میری ماں اسی وقت روضے کی جالی کے قریب ہو کر حضورؐ کی طرف متوجہ ہوئیں اور یوں باتیں کرنے لگیں جیسے آمنے سامنے کی جاتی ہیں عرض کرنے لگیں "یا رسول اللہ! میرے بیٹے کا بھائی کوئی نہیں۔ یہ اکیلا ہے۔ آپ خود اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھیو!"

---

[1] یہ بات مفتی صاحب قبلہ، پیر ولایت شاہ صاحب مرحوم کی روایت سے سنایا کرتے تھے۔

نوٹ

ہسپتال کے مذکورہ ایام میں مفتی صاحب قدس سرہ کی عیادت کیلئے ہسپتال میں بہت سے بزرگ اور احباب ایسے بھی آئے جن کی آمد کی تاریخیں اب مجھے یاد نہیں رہیں۔ مثلاً حضرت علامہ مفتی اعجاز ولی خان رضوی، صاحبزادہ سید محمد حسن شاہ جیلانی نوری، مسٹر غلام مصطفےٰ شاہ مولوی محمد افضل صاحب ڈھڈی (پنجاب یونیورسٹی)، محمد اقبال صابر گجراتی (لاہور چھاؤنی)، مولوی محمد یٰسین صاحب چشتی، مولانا حافظ سید علی صاحب اور شیخ منظور احمد صاحب دگجرات، سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری دگجرات، صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ آلومہار اور بہت سے دیگر حضرات بھی۔ علاوہ ازیں صاحبزادگان مفتی مختار احمد و مفتی اقتدار احمد صاحبان اکثر و بیشتر وقت ہسپتال میں موجود رہے۔ مولانا احمد حسن نوری، محمد صابر امینی، صاحبزادہ افتخار اور راقم الحروف کے برادران، اپنی بساط کے مطابق خدمات انجام دیتے رہے۔ جزاھم اللہ تم احسن الجزاء۔

قطعات

تاریخِ وصال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قطعات تاریخِ وصال

مفسرِ قرآن حکیم الاُمّت حضرت مولانا علامہ مفتی احمد یار خاں اوجھانوی گجراتی برّاللہ مضجعہٗ

از نتیجۂ فکر

سیّد ابوالکمال برقؔ نوشاہی سجادہ نشین دربار نوشاہی ڈوگہ شریف ضلع گجرات

فدائے ملّتِ مختارِ عالم   حکیمِ اُمّتِ سرکارِ عالم

فقیہہ عصر، فاضل شیخِ قرآن   جنیدِ وقت او شبلیِ دوراں

بعلم و فضل بُد اعلیٰ مقامش   بہ تفسیر نعیمی زندہ نامش

وحید العصر در تحریر و تقریر   خطیبِ اہلِ سنّت شیخِ تفسیر

دریغا! مردِ راہ از ما نہاں شد   روانِ او سوئے جنت رواں شد

حیاتش بود در عالم کرامت   وفاتش از علاماتِ قیامت

چوں یکتا بُود او اندر شرافت

وفاتش برقؔ! گو "شمعِ شرافت"

۱۳۹۱ھ

قطعۂ تاریخ

وفات حضرت مولانا احمد یار خاں نعیمی گجراتی

سنہ ۱۹۷۱ء

نتیجہ فکر

حضرت مولانا سید شریف احمد شرافت نوشاہی مدظلہ

آفتابِ شرع، احمد یار خاں ذاکرِ اسمِ خدا شام و پگاہ

حاجیِ حرمین ہم مفتیِ دیں فاضلِ تفسیرِ قرآں ہم چو ماہ

در حدیث و فقہ کس مثلش نبود صوفیانِ اہل حق را بود شاہ

آں حکیمِ امتِ فخرِ رُسل یافت سوئے جنت الفردوس راہ

از شرافت سالِ ترحیلش شنو

"مخزنِ انوار" شد مستور آہ"

۱۹ء ۷۱